بصائر

ڈاکٹر اسرار احمد

مکتبہ خدام القرآن لاہور

36-K ماڈل ٹاؤن لاہور۔فون:3-35869501

www.tanzeem.org

فہرست مضامین

پیش لفظ	3
روشن خیالی اور اسلام	5
عظمت مصطفیٰ ﷺ غیر مسلموں کا اعترافِ حقیقت	16
عالمی حالات، اسلام اور پاکستان	22
دین اور مذہب میں فرق	26
پاکستان کا موجودہ قومی انتشار اور اس کا حل	29
شیعہ سنی اتحاد کی ضرورت و اہمیت	34
علامہ اقبال اور کتابِ زندہ	41
اجتماعی توبہ: ہماری نجات کا واحد ذریعہ	48
نبی اکرم ﷺ سے ہمارے تعلق کی بنیادیں	58
انسانوں سے اللہ تعالیٰ کا واحد مطالبہ	57
عیسائیت، یہودیت اور اسلام: عقائد کا موازنہ	65
فلسطین کا تاریخی پس منظر اور اس کا ہولناک مستقبل	73
خلیج کی حالیہ جنگ......جنگوں کی ماں	82
اسرائیل نامنظور کیوں؟	85
امریکہ کے روشن خیال ایجنڈے کی حقیقت	90
حقیقی جہاد فی سبیل اللہ	94
رسولؐ انقلاب کا طریق انقلاب	101
پاکستان کی قومی سیاست میں مذہبی جماعتوں کا کردار	110

پیش لفظ

ڈاکٹر اسرار احمد بنیادی طور پر اس بحرِ بے کنار کے غوطہ خور ہیں جسے اللہ رب العزت نے انسانوں کی ہدایت کے لیے سرور کائنات کے ذریعے رواں دواں کیا۔ ڈاکٹر اسرار احمد کہتے ہیں کہ لڑکپن میں ہی اُنہیں قرآن کے سحر انگیز بیان اور اُس کے حسین اندازِ ابلاغ نے اپنی گرفت میں لے لیا تھا۔ راقم کی نظر میں ہدایت کے اِس سمندر میں ڈبکی لگانے والا ہر وہ طالب علم کامیاب و کامران رہا جس نے تفسیر نبویؐ کی روشنی میں قرآن کو سمجھنے اور سمجھانے کی کوشش کی کیونکہ قرآن کے حقیقی مفسر تو صرف اور صرف نبی اکرمؐ ہیں۔ ڈاکٹر اسرار احمد نے اس حقیقت کا صحیح ادراک کیا، چنانچہ فہم قرآن اور تفہیم قرآن کے لیے ہمیشہ حدیث نبویؐ سے راہنمائی حاصل کی۔ قرآن کا اعجاز ہے کہ وہ اپنے قاری کو ذہنی وسعت عطا کرتا ہے چنانچہ نوعمری میں ہی کلام اقبال کو سمجھنے کی بھی اچھی خاصی صلاحیت پیدا ہوگئی۔ جب سکول کے طالب علم تھے تو جماعت اسلامی اپنے ابتدائی مراحل طے کر رہی تھی اور مولانا مودودیؒ کی تحریریں باشعور مسلمانوں کے اذہان میں ہلچل مچا رہی تھیں۔ لہٰذا کلام اقبال اور مولانا کی تحریروں نے دو آتشہ کا کام کیا۔ نتیجتاً جہاں ذاتی اور انفرادی سطح پر قرآن کا مردِ مطلوب بننے کی سعی و جہد شروع کی وہاں اجتماعی و ریاستی سطح پر ایسا انقلاب برپا کرنے کی آرزو پیدا ہوئی جس سے وہ اسلامی فلاحی ریاست جنم لے جو دنیا کو خلافت راشدہ کے دور کی جھلک دکھا دے چنانچہ دروس قرآن کا ایک سلسلہ شروع کیا گیا جس میں اس بات پر بھرپور طریقے سے زور دیا گیا کہ دوسرے مذاہب کی طرح اسلام محض ایک مذہب نہیں ہے بلکہ ایک دین ہے، مذہب یقیناً اس کل کا جزو لاینفک ہے لیکن بدقسمتی سے دو صدی کی غلامی سے انسانی زندگی کے اجتماعی پہلو نظروں سے اوجھل ہوگئے اور اسلام بسم اللہ کے گنبد میں بند کر دیا گیا۔ اس امر کی شدید ضرورت تھی کہ اجتماعی زندگی کے شعبوں یعنی سیاست، معاشرت اور معیشت پر کھل کر بات کی جائے۔ لہٰذا دروس قرآن کے ساتھ ساتھ ماہنامہ میثاق کے اداریوں میں بھی اِن موضوعات پر خوب بحث کی گئی۔ سانحہ مشرقی

پاکستان سے چند ماہ پہلے جب مغربی پاکستان میں بنگال کے باغیوں کو بزور بازو کچل دینے کے نعرے بلند ہو رہے تھے، میثاق کے صفحات حکمرانوں اور سیاستدانوں سے پرزور اپیل کر رہے تھے کہ تنازعہ کو سیاسی سطح پر اور مذاکرات سے حل کیا جانا چاہیے۔ یہ سیاسی بصیرت اور دور بینی بھی اللہ رب العزت نے قرآن کے طفیل عطا کی۔ اس پس منظر میں بصائر کے نام سے ڈاکٹر اسرار احمد کے اخباری کالموں کا یہ منتخب مجموعہ پڑھنا ایک قاری کے لیے بہت مفید ثابت ہوگا۔ اکثر تجزیہ نگار اور کالم نویس تحریر کرتے وقت چاہے حکمرانوں اور مقتدر قوتوں پر کتنی ہی تنقید کریں لیکن عوامی رجحان کا اثر لازماً قبول کرتے ہیں۔ لیکن ڈاکٹر صاحب نے اُن غلط رسومات کی بھی ڈٹ کر مخالفت کی جو عوامی سطح پر پختہ ہو کر ایمان اور عقیدہ کی صورت اختیار کر چکی تھیں۔ بصائر کا مطالعہ کرنے کے بعد ایک قاری کو محسوس ہوگا کہ تبصرہ کتنا بے لاگ ہے اور حالات و واقعات کا تجزیہ ایسے کیا ہے جیسے کوئی ماہر سرجن آپریشن کر رہا ہو۔ بصائر کے مطالعہ سے قاری یقیناً حیرت میں ڈوب جائے گا کہ منبر و محراب کے آدمی کا وژن اتنا وسیع ہے اور بین الاقوامی صورتحال پر نظر اتنی گہری ہے۔ ڈاکٹر صاحب کا پاکستان سے وہی تعلق ہے جو بچے کا آغوش مادر سے ہوتا ہے لیکن میٹھی باتوں اور جھوٹی تسلیوں کی بجائے اُن کے قلم نے ہمیشہ حق اور سچ اُگلا جو بعض سب ''اچھا'' قسم کے لوگوں نے ناپسند کیا اور اِن کالموں کے خلاف شدید ردِعمل کا اظہار کیا۔ بصائر کے مطالعہ سے اقبال کا یہ مصرعہ سمجھنے میں بڑی سہولت ہوگی کہ ع

جدا ہو دیں سیاست سے تو رہ جاتی ہے چنگیزی

زیر نظر کتاب کی تیاری کے تمام مراحل میں عزیزم وسیم احمد (نائب ناظم شعبہ نشر و اشاعت) کی محنت اور دلچسپی لائق تحسین ہے۔ امید ہے یہ کتاب دین کے اہم مباحث کی تفہیم کی غرض سے دعوتی مقاصد کے لیے بہت مفید ہوگی۔

ایوب بیگ مرزا
ناظم نشر و اشاعت

روشن خیالی اور اسلام

روشن خیالی کا آغاز اسلام، بلکہ زیادہ صحیح الفاظ میں قرآن سے ہوا ہے۔اس سے پہلے دنیا توہمات میں مبتلا تھی۔ایسے عقائد موجود تھے جن کا کوئی سر پیر نہ تھا۔زلزلہ کے متعلق کہا جاتا رہا ہے کہ یہ زمین ایک بیل اپنے ایک سینگ پر اٹھائے کھڑا ہے، جب بیچارہ بیل تھک کر اسے ایک سے دوسرے سینگ پر منتقل کرتا ہے تو زلزلہ آتا ہے۔کیا اس عقیدے کی کوئی عقلی یا سائنسی بنیاد ہے؟ کیا اللہ کی اتاری ہوئی کسی کتاب میں اس کا ذکر ہے؟ اس قسم کے توہمات سے انسان کو قرآن نے نکالا۔اس ضمن میں قرآن کی سب سے پہلی اور بنیادی ہدایت یہ تھی کہ: ''مت پیچھے لگو کسی ایسی چیز کے جس کے لیے تمہارے پاس علم نہیں ہے۔ بے شک کان اور آنکھ اور دماغ ان سب کی اس سے پوچھ ہوگی۔'' (بنی اسرائیل) یعنی یہ جو ہم نے تمہیں سماعت اور بصارت دی ہے اور ان دونوں کے جو Sense Data دماغ میں فیڈ ہوتے ہیں، ان سب کا تم سے محاسبہ ہوگا۔پوچھا جائے گا کہ اس سے کام کیوں نہیں لیا، توہمات میں کیوں پڑے رہے! ذہن میں رکھیے کہ علم کی ایک قسم وہ ہے جسے ہم کسبی علم (Acquired Knowledge) کہتے ہیں۔اسے انسان خود حاصل کرتا ہے۔آنکھ سے دیکھا، کان سے سنا، ہاتھ سے چھوا، زبان سے چکھا، ناک سے سونگھا، یہ Sense Data دماغ میں فیڈ ہو جاتا ہے۔اس طرح قدم بقدم انسان کا علم بڑھتا چلا جاتا ہے، جس کی میں بڑی سادہ سی مثال دیا کرتا ہوں۔ایک زمانہ تھا کہ ہمارے آباء واجداد کی خوراک پھل، جڑی بوٹیاں اور جڑیں ہوتی تھیں، یا پھر کچا گوشت کھاتے جیسے کہ درندے کھاتے ہیں۔ایک روز کسی شخص نے دیکھا کہ اوپر سے ایک پتھر نیچے چٹان پر گرا تو ایک شعلہ برآمد ہو گیا۔اس نے دو پتھر لے کر ٹکرائے تو توانائی کی پہلی شکل (First Form of Energy) یعنی آگ ایجاد ہوگئی۔اب انسان نے سبزیاں اور گوشت پکا کر کھانا شروع کر دیا۔اس کے بعد کسی نے دیکھا چولھے پر چڑھی ہوئی ہانڈی کے اوپر ڈھکن ہل رہا ہے۔

اس نے سوچا کیا یہ کسی جن بھوت کا کام ہے؟ غور کرنے کے بعد وہ اس نتیجے پر پہنچا کہ ڈھکن کے نیچے جو بھاپ موجود ہے، اس میں طاقت ہے، جو ڈھکن کا اٹھا رہی ہے۔لہٰذا توانائی کا دوسرا ذریعہ (Second Source of Energy) وجود میں آ گیا۔اب سٹیم انجن ایجاد ہو گئے۔پہلے اس ترقی کی رفتار کافی سست تھی، لیکن پچھلے کوئی ڈیڑھ سو سال میں یہ دھاکے کی مانند نہایت تیزی کے ساتھ بڑھی ہے۔یہ علم آج اپنی انتہا کو پہنچ چکا ہے۔جیسے اقبال نے کہا تھا کہ ؏

عروجِ آدمِ خاکی سے انجم سہمے جاتے ہیں
کہ یہ ٹوٹا ہوا تارہ مہِ کامل نہ بن جائے

چاند پر تو انسان اتر گیا، آگے مریخ پر کمندیں ڈال رہا ہے۔بہرحال یہ علم ہے۔

اسلام اسے تسلیم (Acknowledge) کرتا ہے، (دوسری قسم کا علم وہ ہے جو ہمیں وحی کے ذریعے حاصل ہوتا ہے، یعنی علم ہدایت، لیکن اس وقت یہ میرا اصل موضوع نہیں ہے۔) چنانچہ فرمایا گیا کہ علم کی بنیاد پر اپنا موقف قائم کرو۔ہمارے نزدیک وہ علم یا تو سائنس کے ذریعے سے حاصل شدہ ہوگا، یا پھر وحی کے ذریعے سے آیا ہوا علم ہوگا۔ایم این رائے انٹرنیشنل کیمونسٹ پارٹی کی بلند ترین سطح پر قائم ایک تنظیم ''کیمونسٹ انٹرنیشنل'' کا رُکن تھا۔ اس نے لاہور میں ۱۹۲۰ء میں "Historical Role of Islam" کے عنوان سے ایک لیکچر دیا تھا، جس میں اُس نے بڑی ہی خوبصورت بات کہی تھی۔اس کا کہنا تھا کہ مسلمانوں نے چوبیس برس کی قلیل مدت میں طوفان کی طرح جو فتوحات حاصل کیں، اِدھر دریائے جیحوں (Oxus) اور اُدھر بحرالکاہل تک پہنچ گئے، تو اکثر لوگ ان فتوحات کی برق رفتاری کا موازنہ دوسرے فاتحین سے کر بیٹھتے ہیں۔جیسے چنگیز خان مشرق سے چلتا ہوا مغرب میں پہنچ گیا تھا، اٹیلا بھی مشرق سے مغرب تک پہنچ گیا تھا، اسی طرح سکندرِ اعظم بھی مقدونیہ سے چل کر دریائے بیاس تک آ گیا تھا۔لیکن ان تمام فاتحین کی اور مسلمانوں کی فتوحات میں بڑا بنیادی فرق ہے۔چنگیز خان اور سکندرِ اعظم کی فتوحات کے نتیجے میں کوئی تہذیب وجود میں نہیں آئی، دنیا کو روشنی نہیں ملی، نئے علوم کی ایجاد نہیں ہوئی، جب کہ

مسلمانوں کی فتوحات نے ایک تہذیب اور تمدن کو جنم دیا، تمام پرانے علوم کو دوبارہ زندہ کر دیا۔ اُس وقت یورپ تاریک دور (Dark Ages) سے گزر رہا تھا۔ اگرچہ ہر ملک کا اپنا بادشاہ تھا، لیکن سب کے اوپر پوپ تھا اور اصل حکومت اسی کی تھی۔ ہر معاملے میں اسی کا حکم چلتا تھا، اور اس نے سائنس اور فلسفہ کی تعلیم کو حرام قرار دے رکھا تھا۔ اس کا حکم تھا کہ اگر کہیں سے سائنس کی کتابیں نکل آئیں تو اس گھر کو آگ لگا دی جائے، کسی نے فلسفہ پڑھا ہے تو اس کو زندہ جلا دیا جائے۔ پوپ جو کہہ دیتا بس وہی قانون تھا۔ تورات کا جو قانون حضرت مسیح علیہ السلام دے کر گئے تھے اس کو تو سینٹ پال نے منسوخ (Abrogate) کر دیا۔ کوئی شریعت نہیں رہی تھی۔ اس کے بعد تو پوپ کا حکم ہی شریعت کا درجہ اختیار کر گیا۔ اس اعتبار سے پورا یورپ پوپ کے زیر اثر تھا۔ امریکہ کا تو اُس وقت وجود ہی نہیں تھا۔ اگر تھا بھی تو دنیا نہیں جانتی تھی کہ وہاں کیا ہو رہا ہے۔ وہاں وحشی قبائل رہتے تھے جو کسی طرح کی تہذیب و تمدن سے نا آشنا تھے۔ اس سے پہلے یونانی دور میں یورپ متمدن رہا تھا اور وہاں فلسفہ اور سائنس کے میدان میں کافی ترقی ہوئی تھی، لیکن پوپ کے تسلط نے تاریکی پیدا کر دی تھی۔
ایم این رائے کے مطابق، ایسے حالات میں مسلمانوں نے دنیا کو روشنی دی۔ اس حوالے سے روشن ترین عہد عباسی دور حکومت کا تھا، جس میں قدیم یونان کے تمام علوم کا عربی زبان میں ترجمہ کیا گیا۔ سقراط، افلاطون اور ارسطو کو مسلمانوں نے ہی زندہ کیا ہے۔ اسی طرح ہندوستان سے علم طب بھی لیا، منطق بھی لی اور حساب بھی لیا، پھر اُن علوم کو وسعت اور ترقی بھی دی گئی۔ لہٰذا اُس وقت پوری دنیا کے اندر روشن خیال معاشرہ مسلمانوں کا تھا۔ یہ ایک ایسے شخص کی رائے ہے جو ہندو بھی تھا اور کمیونسٹ بھی۔ تیسری بات علامہ اقبال نے فرمائی ہے، جو بہت گہری ہے اور یہ صرف وہی کہہ سکتے تھے۔ وہ کہتے ہیں کہ:

"The inner core of the present western civilization is Quranic"

ایک طرف تو علامہ اقبال مغربی تہذیب کی شدید مذمت کرتے ہیں۔ جیسے ؎

تمہاری تہذیب اپنے خنجر سے آپ ہی خودکشی کرے گی
جو شاخ نازک پہ آشیانہ بنے گا، ناپائیدار ہو گا!

اور ؎

نظر کو خیرہ کرتی ہے چمک تہذیب حاضر کی
یہ صناعی مگر جھوٹے نگوں کی ریزہ کاری ہے!

لیکن دوسری طرف کہتے ہیں کہ اس تہذیب کا (Inner Core) قرآنی ہے۔
سائنس میں موجودہ ترقی ایسے حاصل ہوئی کہ جب بنو عباس نے مسلم دنیا کے قلب میں قائم بنو اُمیہ کی حکومت کا خاتمہ کر دیا تو ان کا ایک شہزادہ بچ کر وہاں سے نکل بھاگا، اس نے سپین جا کر وہاں ایک زبردست حکومت قائم کر لی، جسے مسلمان پہلے ہی فتح کر چکے تھے۔ سپین کو طارق بن زیاد نے (۷۱۲/۷۱۳ء) میں فتح کیا تھا۔ اس موقع پر یہودیوں نے مسلمانوں کی مدد کی تھی اور انہیں راستے بتائے تھے، کیونکہ مسلمان فوج کسی نامعلوم مقام پر اتر گئی تھی اور اپنی کشتیاں بھی جلا چکی تھی۔ یہ وہ دور تھا جب یہودیوں کو عیسائیوں کی جانب سے شدید تعذیب (Persecution) کا سامنا تھا، ان پر تشدد ہوتا تھا، انہیں ٹارچر کیا جاتا تھا، ان سے نفرت کی جاتی تھی۔ عیسائی ان سے گھن کھاتے تھے، لہٰذا انہیں شہروں میں آباد ہونے کی اجازت نہیں تھی۔ ان کے لیے شہروں سے باہر اقلیتی محلے (Ghetto) قائم تھے۔ شام کو انہیں دو، تین گھنٹوں کے لیے شہر میں آنے کی اجازت تھی تاکہ وہ خرید و فروخت کر سکیں۔ ان اوقات کے علاوہ شہر میں ان کا داخلہ بند ہوتا۔ پھر انہیں زندہ بھی جلا دیا جاتا تھا، خاص طور پر سپین میں۔ اُس وقت سپین سو فی صد رومن کیتھولک ملک تھا، اور آج بھی ایسا ہی ہے۔
بہرحال مسلمانوں نے سپین میں اپنی حکومت قائم کرنے کے بعد یہودیوں کو اپنا محسن سمجھا۔ لہٰذا انہیں کندھوں پر اٹھایا، سر پر بٹھایا اور بہت عزت و توقیر دی۔ اسی لیے بن گوریان نے اپنی کتاب میں لکھا ہے کہ: "Muslim Spain was the golden era of our diaspora" ”مسلم سپین ہمارے دورِ انتشار کا سنہری زمانہ تھا۔“

سن ۷۰ میں یہودیوں کو رومیوں نے فلسطین سے نکال دیا تھا اور وہ دنیا بھر میں منتشر ہو گئے۔ جس کا جہاں سینگ سمایا، چلا گیا۔ چنانچہ یہ روس، شمالی افریقہ، ہندوستان اور ایران چلے گئے، لیکن فلسطین سے بہرحال نکال دیئے گئے۔ یہ یہود کی تاریخ کا دورِ انتشار (Diaspora) کہلاتا ہے، جو انتہائی ذلت کا دور تھا۔ ہر جگہ یہودی کا لفظ ایک گالی بن چکا تھا۔ چنانچہ مسلمانوں نے سپین میں ان کو سہارا دیا۔ لیکن یہاں بیٹھ کر انہوں نے کیا کیا، اسے

اچھی طرح جان لیجئے! علم وحکمت کی وہ روشنی جو مشرق وسطیٰ کے اندر پیدا ہوئی تھی، وہ مسلمانوں کے ذریعے ہسپانیہ میں بھی پہنچ گئی۔ ہسپانیہ کے تمام بڑے شہروں میں یونیورسٹیاں قائم ہوئیں۔ جیسے آج ہمارے نوجوان پڑھنے کے لیے یورپ اور امریکہ جاتے ہیں، ایسے ہی اُن کے نوجوان Pyrenees کی پہاڑیوں کا سلسلہ عبور کر کے فرانس، اٹلی اور جرمنی سے ہسپانیہ آتے اور یہاں سے اسلام کی روشنی لے کر جاتے تھے۔ یہ روشنی حریت، آزادی اور مساوات کی روشنی تھی، یعنی کوئی حاکم نہیں، سب اللہ کے محکوم ہیں۔ ع ''تمیز بندہ و آقا فسادِ آدمیت ہے۔'' تمام انسان پیدائشی طور پر برابر ہیں۔ کسی عربی کو کسی عجمی پر اور کسی عجمی کو کسی عربی پر کوئی فضیلت نہیں۔ کوئی گورا کسی کالے سے اور کوئی کالا کسی گورے سے برتر نہیں۔ اسلام نے دنیا کو اخوتِ انسانی کا پیغام دیا کہ تم سب کے سب ایک ہی جوڑے کی اولاد ہو۔ ارشادِ الٰہی ہے: ''اے لوگو! یقیناً ہم نے تمہیں ایک مرد اور ایک عورت سے پیدا کیا'' یعنی آدم اور حوا علیہ السلام سے۔ ''اور تمہیں تقسیم کر دیا قوموں اور قبیلوں میں، تاکہ تم ایک دوسرے کا تعارف حاصل کرو (ایک دوسرے کو پہچانو)۔'' دنیا بھر کے انسانوں کی شکلیں بھی بدل دیں، رنگ بھی بدل دیئے۔ یہ سب تعارف کے لیے ہے، کسی کو برتر ثابت کرنے کے لیے نہیں۔ ''درحقیقت اللہ کے نزدیک تم میں سب سے زیادہ عزت والا وہ ہے جو تمہارے اندر سب زیادہ پرہیزگار ہے۔'' جو بھی تم میں سب سے زیادہ متقی اور پرہیزگار ہے، برائی سے بچتا ہے، لوگوں کے حقوق تلف نہیں کرتا، لوگوں کی عزت سے نہیں کھیلتا وہی اللہ کے ہاں باعزت ہے۔ علم کے یہ دھارے سپین سے پورے یورپ کو جا رہے تھے، لیکن یہودی اُن میں سیاہی گھول رہے تھے۔ بقول شاعر ع ''کون سیاہی گھول رہا ہے وقت کے بہتے دریا میں؟'' چونکہ انہیں عیسائیوں سے انتقام لینا تھا، لہٰذا انہوں نے اس میں زہر گھولا اور وہ اس طرح کہ آزادی کو مادر پدر آزادی بنا دیا، یعنی اخلاقی اقدار سے بھی آزادی، شرم وحیا سے بھی آزادی، سرمائے کے حصول اور استعمال کی آزادی۔ پھر خدا سے آزادی کے نتیجے میں سیکولرازم پیدا کر دیا کہ ریاست کا مذہب سے کوئی تعلق نہیں۔ کوئی مسجد جائے یا مندر، سنیگاگ میں جائے یا چرچ میں، لیکن نظام ریاست، قانونِ ملکی، نظام

معاشرت میں کسی مذہب کا کوئی دخل نہیں ہوگا۔ یہ ہے سیکولرازم کی بنیاد! یہ بیج اس لیے بوئے گئے کہ سیکولرازم یہودیوں کے لیے بہت مفید تھا۔ ظاہر ہے اگر اکثریتی مذہب کی بنیاد پر کسی ملک کا نظام تشکیل پائے گا تو اقلیتی مذاہب کے افراد میں تفریق کی جائے گی۔ ایک عیسائی ریاست کا نظام مکمل طور پر عیسائیت ہی ہوگا اور یہودی وہاں دوسرے درجے کا شہری ہوگا اور اس کی کوئی حیثیت نہیں ہوگی۔ لہٰذا انہوں نے سیکولرازم کے ذریعے سب کو برابر کر دیا کہ ایک ملک کی حدود میں رہنے والے سب برابر کے شہری ہیں، چاہے وہ ہندو ہوں یا مسلمان، سکھ ہوں یا عیسائی، پارسی ہوں یا یہودی۔ اس اعتبار سے وہ اوپر آ گئے اور عیسائیوں کے ہمسر، ہم پلہ، بن گئے۔ اس کے نتیجے میں یورپ میں دو تحریکیں چلی ہیں۔ ایک تحریک احیاء علوم (Renaissance) جس کے تحت جن علوم کے اوپر پوپ نے ڈھکن رکھا ہوا تھا وہ اٹھا دیا گیا کہ فلسفہ پڑھو، سائنس بھی پڑھو، دیکھو، استقراء کرو، نتیجے نکالو۔ پہلے یہ سمجھا جاتا تھا کہ سورج گردش کر رہا ہے، زمین ساکن ہے۔ پھر ایک دور آیا جس میں کہا گیا کہ سورج ساکن ہے، زمین اس کے گرد گھوم رہی ہے۔ اس کے بعد ایک دور آیا جس میں انسان پر یہ منکشف ہوا کہ کائنات کے تمام ستارے اور سیارے گردش میں ہیں۔ اور یہ حقیقت قرآن پہلے سے بیان کر چکا ہے: ﴿كُلٌّ فِيْ فَلَكٍ يَّسْبَحُوْنَ﴾ کہ کائنات کی ہر چیز حرکت میں ہے۔ لہٰذا دیکھو، غور کرو، سوچتے رہو۔ اسی طرح قرآن نے کہا کہ: ﴿اَلَمْ تَرَوْا اَنَّ اللّٰهَ سَخَّرَ لَكُمْ مَّا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ ......﴾ (لقمان: ۲۰) ''کیا تم دیکھتے نہیں ہو کہ اللہ تعالیٰ نے آسمانوں اور زمین میں موجود ہر چیز کو تمہارے لیے مسخر کر دیا ہے۔'' اللہ تعالیٰ نے آسمانوں اور زمین کی ساری چیزوں کو تمہارا خدمت گار بنایا ہے۔ سورج تمہارا خدمت گار ہے، چاند تمہارا خدمت گار ہے، تم انہیں مسخر کر سکتے ہو، ان کے ذریعے سے توانائی اور قوتیں حاصل کرو۔ لہٰذا ہم دیکھتے ہیں کہ آج سورج سے توانائی حاصل کی جا رہی ہے۔ شمسی توانائی سے بجلی بنانے اور کاریں چلانے کی کوشش ہو رہی ہیں۔ یہ چیزیں تمہارے فائدے کے لیے ہیں، یہ تو تمہاری خادم ہیں، لیکن تم نے انہیں خدا بنا دیا؟ یوں یورپ میں سائنس اور فلسفہ کا فروغ ہوا۔ یورپ میں دوسری تحریک اصلاحِ مذہب (Reformation) کی

چلی، جس کے نتیجے میں مذہب اور پاپائیت سے بغاوت ہوگئی۔ یہودی نے تیسرا کام یہ کیا کہ سود کو جائز کر دیا۔ جب تک پوپ کا نظام تھا اس وقت تک پورے یورپ کے اندر سود حرام تھا۔ انفرادی سطح پر مہاجنی سود اور تجارت میں کمرشل انٹرسٹ دونوں حرام تھے۔ پروٹسٹنٹ طبقہ نے پوپ کے خلاف احتجاج کیا اور سب سے پہلے اپنا چرچ علیحدہ کر لیا۔ یوں برطانیہ میں ''چرچ آف انگلینڈ'' وجود میں آیا۔ سب سے پہلا بینک ''بینک آف انگلینڈ'' بھی برطانیہ میں قائم ہوا۔ یہ بھی یہودیوں کی ایجاد تھی۔ اس پوری کائنات میں شر کے منبع اور سرچشمہ شیطانِ لعین کا انسانوں میں سب سے بڑا ایجنٹ یہودی ہے، اور یہود کا سب سے بڑا آلۂ کار پروٹسٹنٹ عیسائی ہیں، خصوصاً وائٹ اینگلو امریکن پروٹسٹنٹس اور وائٹ اینگلوسیکس پروٹسٹنٹس۔ انہی کے ذریعے سے یہودیوں نے چرچ کو علیحدہ کرایا، انہی کے ذریعے سے سود کی اجازت لی اور بینک آف انگلینڈ بنایا۔ یہ تہذیب یورپ میں پھیلتی چلی گئی۔ پوپ کے خلاف شدید نفرت پیدا ہوگئی، کیونکہ انہوں نے بہت دبا کر رکھا تھا کہ سائنس پڑھو نہ فلسفہ۔ تو ردعمل کے طور پر مذہب سے بغاوت پیدا ہوئی اور مذہب دشمنی کا رویہ فروغ پانے لگا۔ مذہب کو کسی شخص کے ذاتی فعل تک محدود کر دیا گیا۔ کوئی شخص اپنے گھر میں نماز پڑھے، روزہ رکھے یا کسی قسم کی کوئی اور عبادت کرے، لیکن ریاست کے سیاسی، معاشرتی اور معاشی نظام (Politico-socio-economic system) سے مذہب کا کوئی تعلق نہیں ہوگا، چاہے وہ اسلام ہو یا عیسائیت، یہودیت ہو یا کوئی اور عقیدہ۔ یورپ میں یہ تہذیب پروان چڑھی ہے، جس کی بنیاد سیکولرازم، سود پر مبنی سرمایہ داری اور لذت پرستی (Headonism) پر ہے۔ اس دوران علم کی دوسری آنکھ بند کر دی گئی اور وحی کی جانب بالکل نہیں دیکھا گیا۔ لہٰذا دنیا میں یہ دجالیت قائم ہوئی۔ سیکولرازم کے تحت مذہب کا تعلق انسان کی اجتماعی زندگی کے تمام گوشوں سے بالکل ختم کر دیا گیا۔ سود کے ذریعے یہودیوں نے پہلے یورپ کو جکڑا تھا، اب وہ چاہتے ہیں کہ پوری انسانیت ہمارے قبضے میں آجائے۔ ورلڈ بینک اور آئی ایم ایف جیسے ادارے اسی لیے وجود میں لائے گئے ہیں۔ یہ فنانشل کلونیلزم ہے جو اس وقت دنیا کے اندر اپنی جکڑ بندی کر رہا ہے۔ گلوبلائزیشن

جب پورے عروج پر آجائے گی، اور Trips کا معاہدہ ہو جائے گا تو ملک بے معنی ہو جائیں گے، حکومتوں کی کوئی حیثیت ہی نہیں ہوگی، اصل میں ملٹی نیشنل کمپنیاں حکومت کر رہی ہوں گی۔ وہ اپنے مینیجرز کو جو تنخواہیں دیتی ہیں، سرکاری ملازمت میں اس کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا۔ یہ درحقیقت یہود کا وہ سارا نظام ہے جس نے پہلے یورپ کو جکڑا، پھر امریکہ کو اور اب وہ پوری دنیا کو جکڑنا چاہتے ہیں۔ بدقسمتی سے اسی تہذیب کو آج ہم چاہتے ہیں۔ ہمارے صدر سمیت حکومتی حلقوں میں سیکولر ذہن رکھنے والے لوگ موجود ہیں۔ وہ سود کو جائز سمجھتے ہیں، انہیں اس میں کوئی غلط بات نظر نہیں آتی۔ اسی طرح بے حیائی کو فروغ دیا جا رہا ہے۔ صدر صاحب نے صاف کہہ دیا ہے کہ جو لوگ لڑکیوں کی ننگی رانیں نہیں دیکھ سکتے وہ اپنی آنکھیں بند کر لیں، ٹی وی کو آف کر دیں۔ ہم تو خواتین کو کرکٹ بھی کھلائیں گے اور ہاکی بھی۔ جو انہیں نیکروں میں نہیں دیکھ سکتا وہ نہ دیکھے۔ اسمبلیوں میں ۳۳ فیصد سیٹیں دے کر ہم ایک دم چالیس ہزار عورتوں کو گھروں سے نکال کر میدان میں لے آئے ہیں۔

یہودیوں کا جو پروگرام اس وقت دنیا میں چل رہا ہے، ان کے اوّلین آلۂ کار برطانیہ اور امریکہ ہیں۔ یہ دونوں یک جان دو قالب (Hand in Glove) ہیں۔ باقی عیسائی دنیا بھی ان کے تابع ہو چکی ہے۔ اب یہ اس کو گلوبلائز کرنا چاہتے ہیں۔ چنانچہ جو بھی ان کی تعلیم پا کر آتا ہے، ان کی تہذیب کے رنگ میں رنگا جاتا ہے۔ ایسے تمام افراد ان کے ایجنٹ ہیں، چاہے وہ عرب ہوں یا غیر عرب، ہندوستان ہوں یا پاکستانی۔ ان کی برین واشنگ کی جا چکی ہے۔ بقول شاعر ؎

اس نے اپنا بنا کے چھوڑ دیا
کیا اسیری ہے، کیا رہائی ہے!

انہوں نے یہاں کی سول سروس اور فوج کی ایک خاص نہج پر تربیت کی ہے۔ وہ اگرچہ چلے گئے ہیں لیکن درحقیقت By Proxy حکومت انہی کی ہو رہی ہے۔ انہی کے غلام، کاسہ لیس اور انہی کے جوتوں کی ٹوہ چاٹنے والے اس وقت عالم اسلام پر حکمران ہیں۔ آج اس تہذیب کو پوری دنیائے اسلام میں جو شخص سب سے بڑھ کر فروغ دینے کی کوشش

کر رہا ہے، وہ ہمارے صدر مشرف ہیں۔ انہوں نے ۳۳ فیصد عورتوں کو اسمبلیوں میں بٹھانے کا جو قدم اٹھایا ہے، ایسا تو آج تک دنیا کے کسی ملک میں نہیں ہوا۔ کسی مسلمان ملک تو کجا، امریکہ میں نہیں ہے جو جمہوریت کا سب سے بڑا علمبردار ہے۔ ہندوستان میں بھی نہیں ہے، جس کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ وہاں جمہوریت کا ہونا ایک معجزہ ہے۔ خواندگی کی شرح اتنی کم ہے، لیکن پھر بھی جمہوریت کام کر رہی ہے۔ وہاں پہلے دن جو گاڑی دستور کی پٹڑی پر چلنی شروع ہوئی تھی، وہ آج تک چل رہی ہے۔ وہاں کبھی کوئی فوجی حکومت نہیں آئی۔ ایک بار تھوڑے سے عرصے کے لیے ایمرجنسی لگی تھی، لیکن وہ کوئی بالائے دستور کام نہیں تھا۔ وہاں یہ کبھی نہیں ہوا کہ ایک آیا تو سارا دستور ختم کر کے اپنا بنا رہا ہے، دوسرا آیا تو پھر سارا دستور ختم کر کے ججوں سے پی سی او کے تحت حلف اٹھوا رہا ہے۔ یہ کھیل پاکستان میں ہوا ہے۔ اب اس میں سب سے بڑھ کر انہوں نے یہ کیا ہے کہ عورتوں کو گھر سے نکالو، انہیں میدان کے اندر لاؤ۔ جو نہیں دیکھنا چاہتے وہ آنکھیں بند کر لیں۔ قدامت پرست، انتہا پسند لوگ یہ چاہتے ہیں کہ عورت کا جسم ڈھکا رہے، اور عورت برقعے اور پردے کے ساتھ گھر سے نکلے۔ ان دقیانوسی اور تاریک خیال ملاؤں کے پیروکاروں کا زمانہ گزر گیا۔ یہ اگلے وقتوں کے لوگ ہیں، روشن خیالی ہر حال میں ہوگی۔ جیسے کبھی اکبر الہ آبادی نے کہا تھا کہ:

چیز وہ ہے بنے جو یورپ میں
بات وہ ہے جو پائنیر میں چھپے

اسی طرح آج تہذیب وہ ہے جو یورپ کی ہے۔ علامہ اقبال نے کہا اس کا Inner Core اسلامی اور قرآنی ہے، لیکن اس کے گرد جو غلاف چڑھا دیئے گئے ہیں وہ انتہائی خطرناک ہیں۔ اس آزادی کو مادر پدر آزاد بنا دیا گیا ہے کہ اللہ سے آزاد، اخلاقی حدود و قیود سے آزاد، شرم و حیا کی قیود سے بھی آزاد۔ آج اس سارے نظام کا نام روشن خیالی ہے۔ حالانکہ یہ تاریک ترین خیال ہے۔ انسان اپنی عظمت اور اشرف المخلوقات کے منصب سے حیوانیت کی طرف رجوع کر رہا ہے۔ اس ضمن میں، ہماری موجودہ حکومت سب سے بازی لے گئی ہے۔ پوری اسلامی دنیا میں ہمارے حکمران اس نئی تہذیب کے سب سے

بڑے آلۂ کار ہیں۔ ان کے نزدیک سیاست سے مذہب کا کوئی تعلق نہیں رہا۔ سود کی حرمت کی بات کرنے پر کہا جاتا ہے کہ پرانی دنیا کی باتیں کرتے ہو، آج تو یہی چلے گا۔ حکومت کی پوری پالیسی امریکہ ڈکٹیٹ کر رہا ہے۔ نائن الیون کے بعد ہم نے ایک دم جو یوٹرن لیا تھا، اس سے ہر چیز تلپٹ ہوگئی ہے۔ ہماری مذہبی جماعتوں کا کردار بھی بہت مشکوک اور غلط ہے۔ میرے نزدیک وہ اس چیز کے مجرم ہیں کہ جب پاکستان میں پہلی مرتبہ خواتین کو ۳۳ فیصد نمائندگی دینے کا فیصلہ ہوا تو کسی نے اس کے خلاف بیان تک نہیں دیا۔ دراصل ان کی گھٹی میں انتخابات ایسے پڑ گئے ہیں کہ انہوں نے سوچا اگر ہم نے کوئی مظاہرہ کیا یا اس کے خلاف آواز اٹھائی تو کہیں انتخابات ملتوی ہی نہ ہو جائیں۔ جنرل مشرف نے ہمارے سیاسی اور معاشرتی نظام کے اندر اتنی بڑی چھلانگ لگائی اور یہ کچھ نہ بولے۔ اسی انتظام کے تحت الیکشن بھی لڑے، اسی کے تحت عورتوں کی سیٹوں کے لیے بھی مقابلہ کیا۔ مزید یہ کہہ دیا کہ ہم طالبان نہیں ہیں۔ جن شہداء کے خون کی بدولت انہیں اقتدار ملا ہے آج انہی سے اعلانِ براءت کر رہے ہیں جو کچھ مشرف نے کیا ہے وہی یہ کر رہے ہیں۔ کہا جا رہا ہے کہ ہم طالبان نہیں، ہم عورتوں کو برقع اوڑھنے پر مجبور نہیں کریں گے۔ کیوں؟ اسلام میں پردہ ہے یا نہیں؟ انہیں کم از کم صوبہ سرحد میں، جہاں سو فیصد ان کی حکومت ہے، وہاں تو شریعت نافذ کرنی چاہیے۔ سعودی عرب میں آج بھی شرعی قوانین نافذ ہیں۔ وہاں گھر کے اندر ان کی عورتیں بالکل یورپین لباس میں ہوتی ہیں لیکن جب باہر نکلتی ہیں تو برقع لے کر نکلتی ہیں۔ بہرحال حکومت تو جو کچھ کر رہی ہے، لیکن ہماری دینی جماعتوں کا رول بھی صحیح نہیں ہے۔ اب سوچنا یہ ہے کہ کرنا کیا چاہیے! اس سلسلے میں افراد کو اٹھنا پڑے گا۔ انہیں وہ کچھ کرنا ہوگا جو ساٹھ ستر سال پہلے مولانا ظفر علی خان نے کہا تھا۔ اپنی تہذیب کے دفاع میں کھڑا ہونا پڑے گا، لیکن جب تک خالص اسلام کے حوالے سے تحریک نہیں چلے گی کوئی فائدہ نہیں ہوگا۔ گڈمڈ کر کے تحریک چلائیں گے تو گڈمڈ نتیجہ نکلے گا۔ ایوب خان ہٹے گا تو یحییٰ آ جائے گا، یحییٰ خان جائے گا تو بھٹو صاحب آ جائیں گے، اسی طرح کے لوگ آتے رہیں گے۔ اکبر الہ آبادی نے کہا تھا:

ہم ایسی سب کتابیں قابل ضبطی سمجھتے ہیں

کہ جن کو پڑھ کے بیٹے باپ کو خبطی سمجھتے ہیں

یہ پوری تہذیب ہم پر ٹھونسنے کا جو معاملہ ہو رہا ہے یہ لائق ضبطی ہے۔ یہ دو اشعار مجھے بہت پسند ہیں ؎

میں نے دیکھا ہے کہ فیشن میں الجھ کر اکثر
تم نے اسلاف کی عزت کے کفن بیچ دیے
نئی تہذیب کی بے روح بہاروں کے عوض
اپنی تہذیب کے شاداب چمن بیچ دیے!

اصل تہذیب تو ہماری تھی۔ مغرب کی کیا تہذیب ہے! وہاں تو تہذیب کا بیڑا غرق ہو چکا ہے۔ آج مغرب ٹیکنالوجی میں اپنی برتری کی بنیاد پر کھڑا ہے، تہذیب کی بنیاد پر نہیں۔ ان کی تہذیب تو سنڈاس بن چکی ہے۔ جس ملک کا صدر یہ کہتا ہو کہ عنقریب ہماری قوم کی اکثریت حرام زادوں پر مشتمل ہو گی وہاں تہذیب کہاں رہی! اقبال کا کہنا غلط نہیں تھا کہ ؏ ''تمہاری تہذیب اپنے خنجر سے آپ ہی خودکشی کرے گی''۔ ان کی تہذیب مر چکی ہے، البتہ ان کا تمدن ابھی کچھ کھڑا ہے، سیاسی نظام میں کچھ جان ہے۔ یہ ساری طاقت بھی ٹیکنالوجی کے بل بوتے پر ہے، جس کی اقبال نے پیشین گوئی کی تھی کہ ؎

دنیا کو ہے پھر معرکۂ روح و بدن پیش
تہذیب نے پھر اپنے درندوں کو ابھارا
اللہ کو پامردئ مؤمن پہ بھروسا
ابلیس کو یورپ کی مشینوں کا سہارا

یہ وہ درندے ہیں جن کی درندگی پہلے افغانستان میں دیکھ لی گئی، اب عراق میں دیکھی جا رہی ہے۔ اللہ تعالیٰ ہمیں توفیق دے کہ اس معرکۂ روح و بدن میں ہم عملی طور پر کام کرتے ہوئے میدان میں نکلیں۔

⌘⌘⌘

عظمت مصطفیٰ ﷺ: غیر مسلموں کا اعترافِ حقیقت

بیسویں صدی اس اعتبار سے نمایاں ترین صدی ہے کہ سابقہ صدیوں کے دوران حضور ﷺ کی ذات مبارک سے جو تعصب غیر مسلموں کو تھا وہ رفتہ رفتہ اس صدی کے دوران ختم ہوا ہے اور اس صدی کے دوران آپ ﷺ کی عظمت کا اس پہلو سے اعتراف اور اقرار تدریجاً پوری دنیا میں ہوا۔ اس صدی کے آغاز میں اسی شہر لاہور میں ایم این رائے نے 1920ء میں ''بریڈ ہال'' میں ایک لیکچر دیا تھا جس کا موضوع ''The Historical Role of Islam'' تھا۔ اسی نام سے کتاب اب بھی ہندوستان میں طبع ہوتی ہے، جسے بمبئی کا ایک ناشر شائع کرتا ہے' میں نے حیدر آباد دکن میں اس کا نسخہ دیکھا ہے' لیکن پاکستان میں کہیں دستیاب نہیں ہے۔ ایم این رائے کون تھا؟ یہ ''کمیونسٹ انٹرنیشنل'' کا ممبر تھا۔ روس میں 1918 میں اشتراکی انقلاب آیا اور اس کے بعد پوری دنیا میں اس کا بڑا چرچا ہوا اس کے بعد عالمی سطح پر کمیونزم کی جو تنظیم قائم ہوئی وہ ''کمیونسٹ انٹر نیشنل'' کہلاتی تھی۔ دنیا کے چوٹی کے انقلابی لوگ اس کے ممبر تھے۔ ایم این رائے ہندوستان کی جانب سے اس کا رکن تھا جو کہ بہت بڑا انقلابی تھا' لیکن وہ ''Historical Role of Islam'' میں واضح اور بڑے تفصیلی انداز سے لکھتا ہے کہ تاریخ انسانی کا عظیم ترین انقلاب وہ تھا جو محمد عربی ﷺ نے برپا کیا تھا۔ حضور ﷺ کے جانشینوں اور جاں نثاروں نے جس سرعت کے ساتھ فتوحات حاصل کیں اور عراق' شام' ایران' مصر' جس تیزی کے ساتھ فتح کئے' اگرچہ اس تیزی کے ساتھ تاریخ انسانی میں فتوحات پہلے بھی ہوئی ہیں' ریکارڈ پر ہے کہ سکندرِ اعظم مقدونیہ سے چلا تھا اور دریائے بیاس تک پہنچا اور وہ جس تیزی کے ساتھ فتح کرتا ہوا آیا وہ اپنی جگہ بہت بڑی مثال ہے۔ وہ تو مغرب سے مشرق کی طرف آیا تھا جبکہ اٹیلا مشرق سے مغرب کی طرف گیا تھا، چین کے شمال میں صحرائے گوبی سے نکل کر وہ ڈینوب کی وادی تک جا پہنچا تھا۔ لیکن ایم این رائے کہتا ہے کہ ان فاتحین کی

فتوحات محض ہوسِ ملک گیری کا شاخسانہ تھیں، اس نے انہیں ''brute military Campaigns'' قرار دیتے ہوئے کہا کہ اِن کے نتیجے میں کوئی نئی تہذیب یا کوئی نیا تمدن وجود میں نہیں آیا، دنیا میں کوئی روشنی نہیں پھیلی، کوئی علم کا فروغ نہیں ہوا۔ جبکہ محمد عربی ﷺ کے جانشینوں کے ذریعے سے شرقاً غرباً جو فتوحات بڑی تیزی کے ساتھ ہوئی ہیں ان کے نتیجے میں ایک نیا تمدن، نئی تہذیب، علم کی روشنی اور انسانی اقدار کا فروغ وجود میں آیا۔ ایک ایسا معاشرہ وجود میں آیا جو ہر طرح کی زیادتیوں سے پاک تھا۔ اس میں سیاسی جبر نہیں تھا، اس میں معاشی استحصال نہیں تھا، اس میں کوئی سماجی فرق وتفاوت نہیں تھا۔ جیسا کہ علامہ اقبال نے بھی محمد ﷺ کے بارے میں کہا ہے کہ ؎

در شبستانِ حرا خلوت گزید
قوم و آئین و حکومت آفرید

دنیا میں اور بھی بڑے بڑے لوگ رہے ہیں جو سالہا سال تک پہاڑوں کی غاروں کے اندر تپسیائیں کرتے رہے ہیں، لیکن محمد عربی ﷺ نے غارِ حرا میں چند روز کے لیے جو خلوت گزینی اختیار کی تھی وہ اس قدر productive اور نتیجہ خیز تھی کہ اس سے نئی قوم، نیا تمدن، نیا آئین اور حکومت وجود میں آ گئی۔ یہ ہے آنحضور ﷺ کی وہ عظمت کہ جس کا اظہار ایم این رائے نے اس صدی کے ربع اوّل کے آخری سالوں میں کیا، جو مسلمان نہیں، ہندو کمیونسٹ تھا۔ دوسری طرف اس صدی کے ربع آخر کے ابتدائی سالوں میں امریکہ میں ڈاکٹر مائیکل ہارٹ کی کتاب ''The Hundred'' 1980ء میں منظر عام پر آئی، جس میں اس نے پوری معلوم تاریخ انسانی کا جائزہ لیا ہے کہ تاریخ کے سفر کے دوران کن کن شخصیات نے اس تاریخی دھارے کا رخ موڑا ہے۔ اس نے ایسے سو افراد کو چن کر ان پر کتاب لکھی ہے اور ان کے اندر بھی درجہ بندی (Gradation) کی ہے کہ کس شخصیت نے سب سے زیادہ تاریخ کے دھارے کو متاثر کیا ہے اور سب سے زیادہ گمبھیر انداز میں اسے موڑا ہے۔ اس نے حضرت محمد ﷺ کو اس درجہ بندی میں سب سے اوپر رکھا ہے۔ کتاب کا مصنف تا حال عیسائی ہے اور ابھی زندہ

ہے۔ وہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو تیسرے نمبر پر لایا ہے جبکہ نیوٹن کو دوسرے نمبر لایا ہے۔ نیوٹن کی فزکس نے جس طرح سے تاریخ انسانی کو متاثر کیا ہے اس میں واقعتاً کوئی شک نہیں۔ سائنس اور ٹیکنالوجی کے پورے explosion کا نقطۂ آغاز نیوٹن ہے۔ شخصیات کے انتخاب اور درجہ بندی میں مؤلف نے کوئی مذہبی پہلو مدنظر نہیں رکھا، نہ ہی اپنے عقائد کو پیش نظر رکھا ہے، بلکہ اس کا موضوع ہی یہ ہے کہ تاریخ انسانی کے دھارے کے رخ کو موڑنے والی کون کون سے شخصیات ہیں۔ ان شخصیات میں نمبر ایک پر محمد رسول اللہ ﷺ نمبر دو پر نیوٹن اور نمبر تین پر حضرت مسیح علیہ السلام ہیں۔ مسلمانوں میں سے اس نے ایک اور شخصیت کو ان سو 100 افراد کی فہرست میں شامل کیا ہے اور وہ ہیں ٹھیک پچاسویں نمبر پر حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ۔ اب یہاں ایک سوال پیدا ہوتا ہے، بلکہ اس نے خود سوال اٹھایا ہے کہ میں ایک عیسائی ہوں اور عیسائی ہوتے ہوئے محمد ﷺ کو میں نمبر ایک پر کس اعتبار سے رکھ رہا ہوں؟ اس کا جواب وہ خود دیتا ہے:

This is because he is the only person supremely successful in both the religious and the secular fields.

یہ بہت گمبھیر اور معنی خیز جملہ ہے۔ لیکن سمجھنے کے لیے پہلے یہ سمجھنا ہوگا کہ اس وقت کی عالمی فضا میں انسانی زندگی کو دو جداگانہ گوشوں میں تقسیم کر دیا گیا ہے۔ ایک مذہب کا گوشہ ہے، اس کا تعلق اجتماعیات سے نہیں ہے، بلکہ صرف افراد سے ہے کہ ہر فرد کو اجازت ہے کہ جس کو چاہے مانے، جس پر چاہے یقین رکھے، ایک خدا کو مانے، سو کو مانے، کسی کو نہ مانے، فرد کو اس کی پوری آزادی حاصل ہے، جسے چاہے پوجے، پتھروں کو پوجے، درختوں کو پوجے، ستاروں کو پوجے، چاند کو پوجے، اسے اجازت ہے۔ لیکن یہ معاملہ انفرادی ہے۔ اس میں مراسم عبودیت (rituals) کے علاوہ کچھ سماجی رسومات (Social Customs) کو بھی شامل کر لیا جاتا ہے۔ مثلاً بچے کے پیدائش ہوئی ہے تو اس کی خوشی کیسے منائیں، کوئی فوت ہو گیا ہے تو اس کی میت کو کیسے ٹھکانے لگائیں؟ جلائیں، دفن کریں

یا کہیں رکھ دیں کہ چیل اور کوے کھا جائیں' وغیرہ۔ اس کی بھی ہر شخص کو آزادی ہے۔ لیکن یہ تینوں چیزیں عقیدہ (dogma)' مراسم عبودیت (rituals) اور سماجی رسوم (Social customs) انفرادی زندگی سے متعلق ہیں۔ دوسری طرف معاشرتی' معاشی اور سیاسی نظام کا تعلق زندگی کے سیکولر میدان سے سمجھا جاتا ہے جس کا کسی مذہب سے کوئی تعلق نہیں۔ اس پر تو لوگ خود غور کریں گے' ان کے نمائندے بیٹھیں گے اور طے کریں گے' اور وہ بیٹھ کر اکثریت سے جو طے کرلیں وہی سماجی اقدار فروغ پا جائیں گی۔ جو بھی اکثریت سے طے کرلیں کہ یہ سماجی برائیاں ہیں ان کا وہ قلع قمع کریں گے۔ اگر وہ شراب کی اجازت دینا چاہیں تو دیں اور اگر شراب پر پابندی لگانا چاہیں تو پابندی لگائیں۔ زنا کو قابل دست اندازی پولیس جرم قرار دینا چاہیں گے تو دے دیں گے' اگر زنا بالرضا ہے تو اس میں کوئی جرم والی بات ہی نہیں۔ اگر اس میں کسی شوہر کا حق مارا گیا ہو تو وہ جائے اور سول کورٹ مین مقدمہ دائر کردے۔ اسی طرح اگر چاہیں گے تو دو مردوں کی شادی کو بھی قانونی حیثیت دے دیں گے کہ ٹھیک ہے ایک شخص ملکی قانون میں شوہر کی حیثیت اور دوسرا شخص بیوی کی حیثیت رکھتا ہے۔ گویا سماجی' معاشی' یا سیاسی معاملات میں سے کسی کا مذہب سے کوئی تعلق نہیں کیونکہ یہ Secular field of life ہے۔ اب نوٹ کیجیے کہ ڈاکٹر مائیکل ہارٹ کا یہ بات کہنے کا مقصد یہ ہے کہ تاریخ انسانی میں جتنی عظیم شخصیات ہیں وہ اگر ایک پہلو سے بلندی کی حامل ہیں تو دوسری طرف ان کا سرے سے کوئی مقام نہیں' ممکن ہے وہ کسی معاملے میں صفر ہوں' بلکہ شاید ان کے لیے کوئی minus value معین کی جائے۔ مثلاً مشرق میں گوتم بدھ اور مغرب میں حضرت مسیح علیہ السلام' دونوں کی مذہب اور روحانیت کے میدان میں اور پیروکاروں کی تعداد کے اعتبار سے کتنی عظمت ہے' لیکن ریاست' سیاست اور معاملاتِ ملکی میں ان کا کوئی مقام اور کوئی حصہ نہیں' اس میں وہ دونوں صفر تھے۔ اسی طرح دوسری طرف اٹیلا ہو' سکندر اعظم ہو یا اور بہت بڑے بڑے حکمران جو دنیا میں گزرے ہیں' یہ سیکولر میدان میں تو بہت بلندی پر ہیں لیکن

مذہبی میدان میں اس درجے پستی کا شکار ہیں کہ ہوسکتا ہے کہ صفر سے بھی کام نہ چلے بلکہ منفی minus ویلیو لانی پڑے۔ مائیکل ہارٹ کا کہنا یہ ہے کہ پوری انسانی تاریخ میں محمد ﷺ صرف اور صرف واحد انسان ''The only person'' ہیں جو دونوں میدانوں میں انتہائی بلندی پر ہیں۔ یعنی اور کوئی ہے ہی نہیں' اس کا تقابل کیا ہوگا؟ یہ میں نے آپ کو صدی کے ایک سرے اور دوسرے سرے سے دو مثالیں دی ہیں۔ اب ذرا صدی کے درمیان بھی مثال دے دوں۔ H.G Wells برطانوی سائینٹیفک فکشن رائٹر کی حیثیت سے بڑی شہرت رکھتا تھا۔ اس نے تاریخ عالم پر دو کتابیں ''Short Concise History of the'' اور ''History of the World world'' لکھیں۔ موخر الذکر کتاب زیادہ ضخیم ہے اور اس میں آنحضور ﷺ پر جو باب ہے اس میں اس نے (میں اپنے دل پر جبر کر کے آپ کو بتا رہا ہوں کہ) ابتداء میں حضور ﷺ کی ذاتی' نجی اور خانگی زندگی پر نہایت رکیک حملے کیے ہیں۔ یوں سمجھئے جیسے دو ملعون نام نہاد مسلمانوں' انگلینڈ میں سلمان رشدی اور بنگلہ دیش میں تسلیمہ نسرین نے' آنحضور ﷺ کی شخصیت پر جس قدر چھینٹے اڑائے ہیں اسی طرح کے چھینٹے H.G. Wells نے حضور ﷺ کی ذات مبارکہ پر خصوصاً ازدواجی زندگی کے حوالے سے اڑائے ہیں' لیکن جب وہ اس باب کے آخر میں پہنچتا ہے اور خطبہ حجۃ الوداع کا ذکر کرتا ہے تو آنحضور ﷺ کی عظمت کے سامنے گھٹنے ٹیک کر خراج تحسین پیش کرنے پر مجبور ہو جاتا ہے۔ وہ آپ ﷺ کے الفاظ نقل کرتا ہے: ''لوگو! کسی عربی کو کسی عجمی پر کوئی فضیلت نہیں! اسی طرح کسی عجمی کو عربی پر کوئی فضیلت نہیں! کسی سرخ وسفید رنگ والے شخص کو کسی سیاہ فام پر کوئی فضیلت حاصل نہیں اور اسی طرح کسی سیاہ فام کو کسی سفید فام پر کوئی فضیلت حاصل نہیں فضیلت کی بنیاد صرف تقویٰ ہے۔ تمام انسان آدمؑ کی اولاد ہیں اور آدمؑ کی تخلیق مٹی سے ہوئی ہے''۔ ان جملوں کا وہ باقاعدہ حوالہ دیتا ہے اور پھر لکھتا ہے: ترجمہ: ''اگرچہ انسانی حریت' اخوت اور مساوات کے وعظ تو دنیا میں پہلے بھی بہت سے کہے گئے ہیں اور

ہم دیکھتے ہیں کہ ان چیزوں کے بارے میں مسیح ناصری کے ہاں بھی بہت سے مواعظ حسنہ ملتے ہیں، لیکن یہ تسلیم کئے بغیر چارہ نہیں کہ یہ صرف محمد عربی ﷺ تھے جنہوں نے تاریخ انسانی میں پہلی مرتبہ بالفعل ایک باضابطہ معاشرہ انہی اصولوں پر قائم کر کے دکھایا''۔ آپ اندازہ کیجئے کہ یہ دشمن کا خراج تحسین ہے جو کہ معتقد نہیں ہے۔ سچ ہے کہ اصل فضیلت تو وہ ہے جس کا اعتراف و اقرار دشمن بھی کریں۔ گویا جادو وہ جو سر چڑھ کر بولے۔ ظاہر بات ہے جو دوست ہے، عقیدت مند ہے اور محبت کرنے والا ہے، اس کی نگاہ تو محبوب کی کسی خامی کو دیکھ ہی نہیں سکتی، اس کی طرف سے تو گویا وہ نابینا ہو جاتی ہے جبکہ دشمن کو کوئی خیر اور خوبی نظر نہیں آتی، لیکن اگر کوئی دشمن بھی کسی کی فضیلت کا اعتراف کرے تو پھر اس معاملے میں کسی شک وشبہ کی گنجائش نہیں رہتی۔

⌘⌘⌘

عالمی حالات، اسلام اور پاکستان

موضوع کے حوالے سے ہمیں سب سے پہلے یہ معین کرنا ہوگا کہ موجودہ عالمی حالات کیا ہیں؟ میرے نزدیک عالمی حالات کی تین سطحیں ہیں اور پہلی سطح جو سب سے نمایاں اور اکثر لوگوں کے علم میں ہے کہ امریکہ اس وقت کرہ ارضی کی واحد سپریم طاقت کی حیثیت اختیار کر چکا ہے۔ اس کی حربی قوت کا کوئی اندازہ ممکن نہیں ہے اور یہی وجہ ہے کہ اس کا تکبر اور غرور اس درجہ بڑھ چکا ہے کہ اسے عدل وانصاف کے مسلمہ اصولوں کی نہ فکر ہے نہ لحاظ۔ اب اسے اپنے اتحادیوں کی رائے کا بھی کوئی لحاظ نہیں۔ عراق کے خلاف جنگ کے لیے امریکہ اور یورپ کے اندر وسیع پیمانے پر مظاہرے ہوئے مگر امریکی حکومت نے ان مظاہروں کو پرکاہ کے برابر وقعت نہ دی۔ UNO ساتھ چلنے کے لیے تیار نہ ہوئی تو اس نے اس کو بھی دھکا دیا کہ سمجھتے رہو، ہم سب کچھ تنہا کرنے پر قادر ہیں۔ امریکہ اپنی حربی قوت کے اعتبار سے ایک مست ہاتھی کی مانند ہے جس کا مقابلہ کرنے کی حیثیت نہ یورپ میں ہے اور نہ جاپان میں۔ عالم اسلام کا تو ذکر ہی کیا۔ دوسری سطح پر ایک عالمی نظام ہے جس نے پوری دنیا کو اپنی لپیٹ میں لے لیا ہے اور یہ نظام بے خدا ہی نہیں، خلاف خدا بھی ہے یعنی سیکولرازم اور اس نظام کی تین بنیادیں ہیں۔ اس کی پہلی بنیاد ہے کہ کسی بھی معاشرے کے اجتماعی معاملات میں، ریاست اور حکومت کی سطح پر قانون سازی کے مرحلے میں کسی خدا، کسی آسمانی ہدایت، کسی وحی اور کسی شریعت کو کوئی دخل نہیں۔ گویا کہ پورے اجتماعی نظام سے اللہ تعالیٰ کی ذات کو بے دخل کر دیا گیا۔ سیکولرزم کی دوسری بنیاد کا تعلق معاشی نظام سے ہے یعنی پوری دنیا کا معاشی نظام سود کی لعنت پر مبنی سرمایہ دارانہ نظام پر قائم ہو، سود کے ساتھ اس کی چھوٹی بہن جوا ہے۔ دنیا بھر میں سٹاک ایکسچینج اور دولت کی الٹ پھیر کی بنیاد یہی جوا ہے اور جوئے کے بعد تیسرا ستون انشورنس ہے۔ تیسری بنیاد کا تعلق بے حیائی، عریانی، فحاشی اور آزاد جنس پرستی پر مبنی سماجی نظام ہے جس میں جنس پرستی مرد اور عورت کے درمیان

(Hetrosexual) ہو چاہے دو عورتوں (Lesbians) کے درمیان ہو اور چاہے مردوں (Gays) کے درمیان ہو اس کی کھلی اجازت ہے جس کے نتیجے میں خاندانی نظام تباہ و برباد ہو کر رہ گیا ہے۔ اس کے علاوہ مادر پدر آزاد سماجی نظام ہے جس میں طوائفانہ زندگی (Prostitution) کو بھی ایک قابل احترام پیشہ تصور کیا جاتا ہے۔ فحاشی و عریانی کے اس سیلاب کو یونائیٹڈ نیشنز اسمبلی نے سوشل انجینئرنگ (سماجی تعمیر) کا نام دیا ہے اور اس کا ہدف بھی شمالی افریقہ اور خاص طور پر ایشیاء کے مسلمان ممالک ہیں۔ کیونکہ ان ممالک میں بحیثیت مجموعی خاندانی نظام بھی برقرار ہے۔ شرم و حیا کی کچھ نہ کچھ وقعت اور قیمت ہے، عفت اور عصمت کی کوئی قدر ہے۔ موجودہ عالمی حالات کی تیسری سطح پر ایک مذہبی کشاکش ہے۔ یہ کشاکش ذرا خفیہ ہے اور اس کشاکش میں سب سے مؤثر اور نمایاں کردار یہودیوں کا ہے جو اس وقت عالم انسانیت کی عظیم ترین سازشی قوت ہے۔ یہودیوں کا پروگرام ہے کہ پوری دنیا پر ان کا براہِ راست فوجی نہیں بلکہ اقتصادی قبضہ ہو جائے۔ مزید برآں ان کا پروگرام ہے کہ مشرق وسطیٰ میں ایک بڑی ریاست گریٹر اسرائیل قائم کریں پھر مسجد اقصیٰ اور قبۃ الصخرۃ کو شہید کر کے اس کی جگہ تیسرا ہیکل سلیمانی تعمیر کیا جائے اور اس میں حضرت داؤد علیہ السلام کا تخت لا کر رکھا جائے۔ یہودیوں کے اس پلان میں عیسائی قوتیں ان کی تابع بن چکی ہیں اور موجودہ حالات میں عیسائیوں اور یہودیوں کا مشترکہ دشمن اسلام اور مسلمان ہیں اور سب سے بڑا ٹارگٹ پاکستان ہے اور اس اسلام اور پاکستان مخالف گٹھ جوڑ میں بھارت بھی شامل ہے۔ اب عالمی حالات کے بعد ذرا پاکستان کے حالات کا جائزہ لیں کہ ''کیا پاکستان ایک ناکام ریاست ہے اور اس کا مستقبل مخدوش ہے؟ اور کیا ابھی پاکستان اور پاکستانی قوم کی نجات کا راستہ کھلا ہے؟ ان دونوں سوالوں کے بارے میں میرا جواب ''ہاں'' ہے اور میرا مؤقف ہے کہ پاکستان کے خاتمے کی الٹی گنتی (Count Down) شروع ہو چکی ہے اور اس کے اسباب کو میں دو حصوں میں تقسیم کرتا ہوں۔ پہلا اصل اور بنیادی اور داخلی اور دوسرا فوری اور خارجی۔ پہلا سبب یہ ہے کہ مؤسسین پاکستان علامہ اقبال اور قائداعظم محمد علی جناح نے کہا تھا کہ ''ہم پاکستان اس لیے چاہتے ہیں کہ عہد حاضر میں اسلام

کے اصول حریت و اخوت و مساوات کا ایک عملی نمونہ دنیا کے سامنے پیش کر سکیں تا کہ ایک لائٹ ہاؤس وجود میں آ سکے۔'' مگر ہم نے پاکستان کے قیام کے اصل مقصد کو بھلا دیا اس کا عقلی اعتبار سے یہ نتیجہ ہے کہ پاکستان اپنی وجہ جواز کھو چکا ہے اور اس وقت ہم بے بنیاد ہیں اور مذہبی اعتبار سے اس کا نتیجہ یہ ہے کہ ہم نے اللہ تعالیٰ کے نظام کو نافذ نہ کر کے اس سے وعدہ خلافی کی ہے اور جب کوئی قوم اللہ سے وعدہ خلافی کرے تو اس میں اجتماعی طور پر نفاق اور منافقت کا مرض پیدا کر دیا جاتا ہے اور نفاق اللہ کو کفر سے زیادہ ناپسند ہے۔ دنیا بھر میں پاکستان کے مستقبل کے بارے میں کیا پیشین گوئیاں ہو رہی ہیں سب سے پہلے ایک مسلمان مصنف سید ابوالمعالی کی کتاب (The Twin Eras of Pakistan) کا حوالہ دوں گا جو 1992ء میں شائع ہوئی تھی۔ مصنف نے اپنی اس کتاب میں مجموعی تأثر دیا ہے کہ 2006ء میں پاکستان آٹھ ٹکڑوں میں تقسیم ہو جائے گا۔ دوسری پیشین گوئی امریکہ کی وزارت خارجہ کی پالیسی ونگ کے تھنک ٹینک کی ہے جس میں امریکہ کے سب سے اونچے پندرہ اداروں کے سربراہ شامل ہیں کہ 2020 میں پاکستان نام کا کوئی ملک نہیں رہے گا۔ تیسری پیشین گوئی رابرٹ کیلان کی ہے جس نے 2000ء میں شائع ہونے والے اپنے مضمون میں لکھا کہ پاکستان ہر اعتبار سے ناکام ریاست ہو چکا ہے اور اس میں جلد خانہ جنگی شروع ہو جائے گی۔ یہ پیشین گوئیاں وحی تو نہیں، ان کے غلط ہونے کا امکان ہے لیکن اس میں ان سازشوں کا انعکاس موجود ہے جو فضا کے اندر موجود ہیں۔ ع

تیری بربادیوں کے مشورے ہیں آسمانوں میں

دوسرے خارجی اور فوری سبب کے پیچھے اصل قوت یہود اور اسرائیل کی ہے جو پاکستان کا خاتمہ چاہتے ہیں اور کم از کم یہ کہ اس کا ایٹمی اثاثہ ختم کر دیا جائے تا کہ پاکستان بھارت کا طفیلی ملک بن کر رہ جائے۔ صدر مشرف اور ان کے حواری سمجھ رہے ہیں کہ ہماری باری نہیں آئے گی۔ انہیں جان لینا چاہئے ہماری باری تو آ کر رہے گی۔ ایٹمی اثاثوں کی جو صورت بن چکی ہے وہ بہت مخدوش ہے۔ ہمارے خلاف بھرپور مقدمہ تیار ہو چکا ہے کہ دنیا میں ایٹمی پھیلاؤ کا مرکز پاکستان ہے اور ہم نے اپنے بڑے سائنس دان ڈاکٹر عبدالقدیر

خان سے ٹیلی ویژن پر اعتراف کروا کر اس الزام کو تسلیم بھی کر لیا ہے اور ایک موقع پر صدر مشرف بھی کہہ چکے ہیں کہ پاکستان پر حملہ ہوسکتا ہے۔

ان مایوس کن حالات میں بچاؤ اور نجات کا راستہ کھلا ہے اور وہ یہ ہے کہ ہم حکومتی اور عوامی سطح پر توبہ کریں اور پلٹیں اللہ کی طرف اور پاکستان کے قیام کے مقصد یعنی اسلام کے عادلانہ نظام کو قائم کریں۔ میں یہ نہیں کہتا کہ اسلام کو ایک دم یا ایک دن میں نافذ کروا اور یہ ایک دم ہونے والی بات بھی نہیں ہے۔ لیکن ایک عزم صادق کا آغاز تو ہو۔ حکومت کی سطح پر توبہ کی صورت یہ ہے کہ طے کر دیا جائے:

"No legistation will be done repugnant to the Quran and Sunnah"

یعنی کوئی بھی قانون سازی قرآن و سنت کے خلاف نہیں کی جائے گی اور Existing قوانین بھی خلاف شریعت ہیں تو انہیں ختم کیا جائے جبکہ عوامی سطح پر توبہ یہ ہے کہ عوام انفرادی سطح پر حرام سے اجتناب اور حلال پر اکتفا اور فرائض دینی کی ادائیگی کا فیصلہ کریں۔ بے حیائی، بے شرمی، فحاشی و عریانی سے بچیں اور مغربی تہذیب کو مکمل طور پر خیر باد کہہ دیں۔

⌘⌘⌘

دین اور مذہب میں فرق

لفظ ''مذہب'' اور لفظ ''دین'' میں مفہوم کے اعتبار سے بڑا فرق ہے، اگرچہ ہمارے ہاں عام طور پر اسلام کو مذہب کہا جاتا ہے، لیکن دلچسپ بات یہ ہے کہ پورے قرآن مجید اور حدیث کے ذخیرہ میں اسلام کے لیے مذہب کا لفظ کہیں استعمال نہیں ہوا، بلکہ اس کے لیے ہمیشہ ''دین'' ہی کا لفظ استعمال ہوا ہے۔ سورۃ آل عمران میں فرمایا گیا ''اللہ کی بارگاہ میں مقبول دین تو صرف اسلام ہے۔'' دین اور مذہب میں بنیادی فرق کو سمجھ لیجئے! مذہب ایک جزوی حقیقت ہے۔ یہ صرف چند عقائد اور کچھ مراسم عبودیت کے مجموعے کا نام ہے جبکہ دین سے مراد ہے ایک مکمل نظام زندگی جو تمام پہلوؤں پر حاوی ہو۔ گویا مذہب کے مقابلے میں دین ایک بڑی اور جامع حقیقت ہے۔ اس پس منظر میں اگرچہ یہ کہنا تو شاید درست نہ ہوگا کہ اسلام مذہب نہیں ہے، اس لیے کہ مذہب کے جملہ (Elements) بھی اسلام میں شامل ہیں، اس میں عقائد کا عنصر بھی ہے، ایمانیات ہیں، پھر اس کے مراسم عبودیت ہیں، نماز، روزہ ہے، حج اور زکوۃ ہے، چنانچہ صحیح یہ ہوگا کہ یوں کہا جائے کہ اسلام صرف ایک مذہب نہیں، ایک دین ہے۔ اس میں جہاں مذہب کا پورا خاکہ موجود ہے وہاں ایک مکمل نظام زندگی بھی ہے۔ لہٰذا اسلام اصلاً دین ہے۔

اب اس حوالے سے ایک اہم حقیقت پر بھی غور کیجئے کہ کسی ایک خطہ زمین میں مذاہب تو بیک وقت بہت سے ہوسکتے ہیں لیکن دین ایک وقت میں صرف ایک ہی ہوسکتا ہے۔ یہ کیسے ممکن ہے کہ سرمایہ دارانہ نظام اور اشتراکی نظام کسی خطہ زمین پر یا کسی ایک ملک میں بیک وقت قائم ہوں! حاکمیت تو کسی ایک ہی کی ہوگی۔ یہ نہیں ہوسکتا کہ ملوکیت اور جمہوریت دونوں بیک وقت کسی ملک میں نافذ ہوجائیں۔ اللہ کا نظام ہوگا یا غیر اللہ کا ہوگا۔ نظام دو نہیں ہوسکتے۔ جبکہ خطہ زمین میں مذاہب بیک وقت بہت سے ممکن ہیں۔ ہاں نظاموں کے ضمن میں ایک امکانی صورت پیدا ہوسکتی ہے۔ کہ ایک نظام غالب و برتر ہو اور

وہی حقیقت میں ''نظام'' کہلائے گا اور دوسرا نظام سمٹ کر اور سکڑ کر ایک مذہب کی شکل اختیار کرلے اور اس کے تابع زندگی گزارنے پر آمادہ ہوجائے۔ جیسے علامہ اقبالؒ نے فرمایا:

بندگی میں گھٹ کے رہ جاتی ہے اِک جوئے کم آب
اور آزادی میں بحرِ بیکراں ہے زندگی!

دین جب مغلوب ہوتا ہے تو ایک مذہب کی شکل اختیار کرلیتا ہے۔ اس صورت میں وہ دین نہیں رہتا بلکہ مذہب بن جاتا ہے۔ بالکل اسی طرح جیسے کہ اسلام کے دورِ عروج میں غالب نظام تو اسلام کا تھا، لیکن اس دین کے تابع یہودیت، مجوسیت اور نصرانیت مذاہب کی حیثیت سے برقرار تھے۔ انہیں یہ رعایت دی گئی تھی اور صاف الفاظ میں سنا دیا گیا تھا کہ اگر وہ اسلامی حدود کے اندر رہنا چاہتے ہیں تو انہیں اپنے ہاتھ سے جزیہ دینا ہوگا اور چھوٹے بن کر رہنا ہوگا۔ ''یہاں تک کہ وہ جزیہ دیں اپنے ہاتھ سے اور چھوٹے بن کر رہیں۔'' (التوبہ ۲۵) ملکی قانون اللہ کا ہوگا، غالب نظام اللہ کا ہوگا، اس کے تحت اپنے پرسنل لاء میں اور اپنی ذاتی زندگی میں محدود سطح پر وہ اگر اپنے مذاہب اور اپنے عقائد و رسوم کے مطابق زندگی بسر کرنا چاہیں تو اس کی انہیں اجازت ہوگی۔ اسلام کے دورِ زوال و انحطاط میں یہ صورت برعکس ہوگئی۔ یوں کہا جاسکتا ہے کہ اس برصغیر میں دین انگریز کا تھا۔ دین انگریز کے تحت اسلام نے سمٹ کر ایک مذہب کی صورت اختیار کرلی تھی کہ نمازیں جیسے چاہو پڑھو، انگریز کو کوئی اعتراض نہ تھا، اذانیں بخوشی دیتے رہو، وراثت اور شادی بیاہ کے معاملات بھی اپنے اصول کے مطابق طے کرلو، لیکن ملکی قانون انگریز کی مرضی سے طے ہوگا۔ یہ معاملہ تاجِ برطانیہ کی بادشاہت کے تحت ہوگا، اس میں تم مداخلت نہیں کرسکتے! یہ تھا وہ تصور جس کے بارے میں علامہ اقبال نے بڑی خوبصورت پھبتی چست کی تھی۔ ع

ملا کو جو ہے ہند میں سجدے کی اجازت
ناداں یہ سمجھتا ہے کہ اسلام ہے آزاد!

یعنی اسلام آزاد کہاں ہے؟ وہ سمٹ سکڑ کر اور اپنی اصل حقیقت سے بہت نیچے اتر کر ایک مذہب کی شکل میں باقی ہے۔

دین ہے ہی وہ کہ جو غالب ہو۔ اگر مغلوب ہے تو دین نہیں رہے گا، بلکہ ایک مذہب کی صورت میں سمٹ جائے گا، اور سکڑ جائے گا۔ اس کی اصل حیثیت مجروح ہوجائے گی۔ اس پہلو سے غور کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ اعلیٰ سے اعلیٰ نظام بھی اگر صرف نظری اعتبار سے پیش کیا جارہا ہے، صرف کتابی شکل میں نسلِ انسانی کو دیا گیا ہو تو وہ ایک خیالی جنت کی شکل اختیار کرسکتا ہے، لیکن حجت نہیں بن سکتا۔ نوعِ انسانی پر حجت وہ صرف اس وقت بن سکتا ہے جب اسے قائم کرکے، نافذ کرکے اور چلا کر دکھایا جائے۔

⌘⌘⌘

پاکستان کا موجودہ قومی انتشار اور اس کا حل

اس میں کوئی شک نہیں کہ پاکستان کے قیام اور استحکام کا واحد جواز اسلام ہے۔ پاکستان میں بسنے والوں کی زبانیں، قومیتیں اور ثقافتیں مختلف ہیں لہٰذا ان کے درمیان واحد مشترک رشتہ صرف اور صرف اسلام کا ہے۔ بدقسمتی سے ہم نے یہاں اس کی طرف کوئی پیش قدمی نہیں کی لہٰذا ہمارے درمیان زبان اور نسل کی بنیاد پر عصبیتوں نے نفرت پیدا کی اور 1971ء میں پاکستان دولخت ہوگیا۔ سورۃ السجدہ کی آیت 21 میں ارشاد ربانی ہے: کہ ''ہم انہیں لازماً مزہ چکھائیں گے چھوٹے عذاب کا بڑے عذاب سے پہلے شاید کہ وہ باز آ جائیں۔'' 1971ء میں چھوٹا عذاب آیا۔ بدترین شکست کے کلنک کا ٹیکہ ہمارے ماتھے پر لگا لیکن ہم ہوش میں نہیں آئے، ہمارے طور واطوار نہیں بدلے، ہمارے روز وشب کے انداز نہیں بدلے اور ہماری سوچ نہیں بدلی، اب شاید بڑا عذاب ہمارے سر پر آ گیا ہے۔ آج بھی صوبائی اور لسانی عصبیتیں زہر گھول رہی ہیں اور پاکستان کی سیاست شدید خطرات سے دوچار ہے۔ سورۃ انعام کی آیت 65 کے مطابق عذاب کی تین صورتیں ہوتی ہیں۔ اس آیت میں فرمایا گیا ''اے نبیؐ! ان سے کہہ دیجئے کہ وہ اللہ اس پر قادر ہے کہ تم پر کوئی عذاب اوپر سے اتار دے (یعنی آسمان سے) یا تمہارے قدموں کے نیچے سے (یعنی زمین سے جیسے سونامی) یا تمہیں گروہوں میں تقسیم کرکے آپس میں لڑا دے اور ایک کی طاقت کا مزہ دوسرے کو چکھا دے'' اس وقت صورت حال یہ ہے کہ پاکستان پر تباہی کے بادل ہر چہار طرف سے آ رہے ہیں۔ بلوچستان کی صورتحال سب کے سامنے ہے۔ بلوچستان میں سرداری نظام ہے۔ عوام بنیادی سہولتیں اور تعلیم سے محروم ہیں اور انہیں اپنے حقوق کا شعور ہی نہیں۔ وہ پوری طرح سے سرداروں کے تابع ہیں۔ سرداروں میں شدید احساس محرومی ہے۔ یہ احساس محرومی بار بار اٹھتا رہا ہے۔ گریٹر بلوچستان کی تحریک بڑے زور شور کے ساتھ سابق سوویت یونین کے تعاون سے وہاں چلتی رہی۔ سوویت یونین کے ختم ہونے

سے یہ محسوس ہوا کہ شاید یہ تحریک اب ختم ہوگئی لیکن معاملہ وہی تھا کہ ''آگ دبی ہوئی سمجھ آگ بجھی ہوئی نہ جان'' ان میں احساس محرومی کی وجہ صوبائی خودمختاری کا معاملہ ہے۔ ہمارے ہاں صوبوں کی تقسیم غیر فطری، غیر منطقی اور غیر معقول ہے۔ ایک صوبہ تعداد آبادی کے اعتبار سے بقیہ تینوں صوبوں سے بڑا ہے۔ وہ تعلیم اور ملازمتوں کے اعتبار سے انگریز دور سے ترقی یافتہ تھا۔

اس کا ایک خاص سبب تھا پورے ہندوستان میں مسلمانوں سے انگریزوں نے حکومت چھینی تھی لیکن پنجاب میں آ کر انگریزوں نے مسلمانوں کو سکھا شاہی سے نجات دی۔ زمین وآسمان کا فرق ہوگیا۔ انگریز پنجاب میں مسلمانوں کا محسن بن کر آیا۔ سندھ میں اس نے مسلمانوں یعنی تالپوروں سے حکومت لی۔ لہٰذا سندھ میں انگریزوں کے لیے اچھے جذبات کبھی پیدا نہیں ہوسکے۔ اس فرق کو ذہن میں رکھیں۔ انگریز نے پنجاب کو عسکری و تعلیمی اعتبار سے ترقی دی۔ پاکستان بننے کے بعد زیادہ تعلیم کی وجہ سے پنجاب میں زیادہ ترقی ہوئی۔ اس میں کسی بدنیتی کا دخل نہیں لیکن اس کی وجہ سے بقیہ صوبوں میں احساس محرومی پیدا ہوا۔ ہم نے اپنی تاریخ میں صوبوں کو اتنا مقدس مقام دیا ہوا ہے کہ گویا صوبے آسمان سے نازل ہوئے ہیں۔ کمشنریاں نئی بن گئیں، ضلع نئے بن گئے، تحصیلیں اب ضلع بن گئیں لیکن صوبوں کو ہاتھ نہیں لگانا۔ یہ کوئی آسمان سے لکھا ہوا تو نہیں آیا کہ آپ کو ان صوبوں کو لازماً برقرار رکھنا ہے۔ ہم صوبوں کو تقسیم کر رہے ہیں اور نہ ہی انہیں اختیارات دے رہے ہیں۔ سارے اختیارات اپنے ہاتھ میں رکھنا چاہتے ہیں۔ اگر ہم چھوٹے صوبے بناتے اور انہیں خودمختاری دیتے تو کسی صوبہ میں احساس محرومی پیدا نہ ہوتا۔ اب صورتحال یہ بن چکی ہے کہ بلوچستان میں احساس محرومی کا لاوا پوری طرح پک کر پھٹ رہا ہے۔ اس کی دو شکلیں سامنے آ رہی ہیں۔ ایک عسکری محاذ ہے اور دوسرا سیاسی محاذ، عسکری محاذ پر بلوچ لبریشن آرمی ہے اور سیاسی محاذ پر ہیں سردار۔ بلوچ لبریشن آرمی اہم تنصیبات پر حملے کر رہی ہے اور اس کی پشت پر بین الاقوامی قوتیں ہیں۔ روزنامہ جنگ کے کالم نگار حامد میر نے اپنے ایک کالم میں لکھا ہے کہ ایک بلوچ نوجوان کو روزگار کے بہانے دبئی لے جایا گیا۔ دبئی

سے جعلی افغانستان پاسپورٹ پر بنکاک پہنچایا گیا وہاں بہت سے نوجوان اور بھی تھے ان نوجوانوں کی وہاں ذہن سازی کی گئی اور انہیں سید ابوالمعالی کی کتاب (The twin era of pakistan) سبقاً سبقاً پڑھائی جا رہی ہے۔ اس کتاب کا میں کئی سال سے تذکرہ کرتا رہا ہوں۔ یہ کتاب 1996ء میں شائع ہوئی اور اس میں لکھا گیا کہ 2006ء میں پاکستان کے 8 ٹکڑے ہو جائیں گے۔ ان میں خوشحال ترین علاقہ آزاد بلوچستان کا ہوگا۔ اس کے آثار اب صاف نظر آ رہے ہیں۔ وہاں میگا پروجیکٹس لگائے جا رہے ہیں۔ سرمایہ وہاں جا رہا ہے۔ گویا بلوچستان کو علیحدہ کرنا ایک بین الاقوامی سازش ہے۔ البتہ بیرونی سازش ہمیشہ کسی نہ کسی اندرونی مسئلہ پر انحصار کرتی ہے کہیں کوئی دکھتی رگ پکڑتی ہے۔ بین الاقوامی سازش کا مقصد اس علاقہ کے بے بہا معدنی وسائل پر قبضہ کرنا اور اس علاقے کو ہانگ کانگ کا متبادل بنانا بھی ہوسکتا ہے اب بلوچستان کی صورتحال ایک Dilemma بن چکی ہے۔ اگر طاقت استعمال نہ کی جائے تو گویا کہ پسپائی ہے اور وہ سازش آرام سے Red carpet پر چلتی ہوئی کامیاب ہو جائے گی۔ اگر طاقت استعمال کی جائے تو ردعمل ہوگا۔ مذاکرات جتنے ہو رہے ہیں سب میں ناکامی ہو رہی ہے۔ عطاءاللہ مینگل صاحب نے کہہ دیا بگٹی صاحب سے بات کرو۔ بگٹی صاحب نے کہہ دیا ہم بندوق کی نوک پر بات کرنے کو تیار نہیں۔ گویا کہ حکومت پاکستان بندوق استعمال نہ کرے لیکن مخالفین تو کر رہے ہیں، یہ ہے Dilemma یعنی عقدہ لاینحل۔ طاقت استعمال کریں گے۔ تب ردعمل ہوگا، طاقت استعمال نہ کریں تو پسپائی ہوگی۔ اب اس سے ذرا اوپر چلیے۔ بلوچستان سے تقریباً ملحق وزیرستان ہے۔ وزیرستان میں کتنا عرصہ ہوگیا کہ مٹھی بھر غیر ملکیوں پر فوج کشی ہو رہی ہے۔ مسئلہ تو حل نہیں ہو رہا ہے۔ آپ ان لوگوں کو قتل کر رہے ہیں جو آپ کے اور امریکہ کے محسن تھے۔ وہ روسیوں سے جہاد کے نام پر لڑنے کے لیے آئے تھے۔ یہ کون لوگ ہیں؟ اپنے گھروں کو چھوڑ کر کیوں آئے تھے؟ یہ اسلام کے نام پر آئے تھے اور جہاد کے لیے آئے تھے۔ آج آپ امریکہ کی خوشنودی حاصل کرنے کے لیے انہیں مار رہے ہیں تو کیا فطرت انسانی اسے قبول کرتی ہے؟ یاد رکھیے جو جتنا تمدن سے دور ہوتا ہے وہ اتنا ہی فطرت کے

قریب ہوتا ہے بقول اقبال:

فطرت کے مقاصد کی کرتا ہے نگہبانی
یا بندہ صحرائی یا مرد کہستانی

اب ذرا اور اوپر چلیے۔ شمالی علاقہ جات میں سے گلگت میں تو شیعہ سنی فساد ہوتا تھا اس بار چلپلو اور اسکردو میں بھی ہوا ہے۔ یہ علاقے تو بالکل ہندوستان کی سرحد کے ساتھ لگے ہوئے ہیں۔ ان علاقوں میں فسادات نے وہ صورت اختیار کی کہ کرفیو لگانا پڑا یہ وہ عذاب ہے جس کے بارے میں قرآن میں کہا گیا کہ اللہ تمہیں گروہوں میں تقسیم کر دے اور تم میں سے بعض کو بعض کی طاقت کا مزہ چکھا دے۔ اب ذرا نیچے اتریئے۔ کشمیر میں کیا ہو رہا ہے؟ بگلیہار ڈیم پر مذاکرات ناکام ہو چکے ہیں۔ اب بھارت کی سب سے بڑی دلیل یہ ہوگی کہ ان کا مطالبہ ''ٹائم بار'' ہو چکا ہے۔ اتنے عرصے سے ہم ڈیم بنا رہے ہیں یہ کیوں نہیں بولے۔ ہمارا اتنا پیسہ وہاں خرچ ہو چکا۔ وہ پیچھے ہٹنے کو تیار نہیں ہوں گے اور کیا دنیا کی کوئی طاقت انہیں پیچھے ہٹنے پر مجبور کر سکتی ہے؟ نتیجہ کیا ہوگا؟ پنجاب کے پانی کا سب سے بڑا ذریعہ دریائے چناب ہے۔ اگر بھارت نے اس کا پانی روک لیا تو پنجاب کا بیشتر علاقہ صحرا بن جائے گا۔ ہماری حکومت نے کشمیر پر جو بھی امیدیں ہمیں دلائی تھیں وہ سب خاک میں مل چکی ہیں۔ بھارت نے کہہ دیا ہے کہ کشمیر ہمارا اٹوٹ انگ ہے ہمارے سیکولرازم کی نشانی ہے ہم اس میں کوئی تبدیلی گوارا نہیں کرتے؟ گویا کہ یہ ساری جو خیرسگالی کی فضا بنی تھی، یکطرفہ طور پر بھارت اسے اپنے مفادات کے لیے استعمال کرنا چاہتا ہے کہ آنا جانا ہو، تجارت ہو، فنکاروں کی آمدورفت ہو، محبت کے ترانے ہوں، ثابت کیا جائے کہ ہم تو ایک ہی تھے تقسیم خواہ مخواہ ہوگئی۔ من موہن سنگھ نے کئی بار کہا کہ پاکستان اور بھارت کے درمیان دیوار برلن ختم کرنا میرا مقصد ہے۔ گویا بھارت پاکستان کی سرحدیں ختم کر کے اور پھر ہمیں کھینچ کر اپنے ملک کے اندر شامل کر کے ''اکھنڈ بھارت'' پروگرام کے تحت عمل کر رہا ہے۔ مختصر یہ کہ مسئلہ کشمیر کے حل کی کوئی امید جو ذرا پیدا ہوگئی تھی اب اس کا کوئی امکان نہیں ہے کیونکہ بھارت کسی درجے میں کوئی لچک دکھانے کو تیار نہیں۔ ہمارے ہاں کچھ لوگ

جمہوریت کو ان تمام مسائل کا حل سمجھتے ہیں۔ میری رائے میں پاکستان کی بقا صرف اور صرف اسلامی انقلاب میں ہے۔ البتہ جب تک کوئی انقلاب نہیں آتا، جمہوریت ہونی چاہئے، ورنہ چھوٹے صوبوں کے اندر احساس محرومی بڑھے گا۔ اگر انہیں بات کرنے کا موقع ہو، جمہوری حقوق حاصل ہوں، مطالبوں کے لیے جلسے کریں، جلوس نکالیں تو غبار اندر سے نکل جاتا ہے، بھڑاس نکل جاتی ہے، ورنہ لاوا اندر ہی اندر پک کر پھٹ پڑتا ہے۔ البتہ ہمارے لیے پناہ کا واحد راستہ یہی ہے کہ ہم اسلام کی طرف پیش قدمی کریں۔ کسی بلند تر مقصد کے لیے انسان چھوٹے مفادات کی قربانی دے دیتا ہے جب کوئی مقصد سامنے نہ ہو تو پھر مفادات اور مصلحتیں ہی رہ جائیں گی اور ان میں ٹکراؤ تو ہونا ہی ہے۔ ہماری محرومی ہے کہ ہم اسلام کی طرف سوچنے کو تیار ہی نہیں۔ خدارا سوچئے! وہ مقصد کہاں ہے جس کے لیے پاکستان بنایا تھا؟ نوجوان نسل سوال کرتی ہے کہ پاکستان کیوں بنایا تھا؟ جو ماحول بھارت میں ہے وہی یہاں ہے بینکنگ کا وہی نظام وہاں بھی ہے جو یہاں ہے، وہی ملٹی نیشنل تنظیمیں وہاں بھی ہیں یہاں بھی ہیں، مسجدیں وہاں بھی ہیں یہاں بھی ہیں، پھر آخر کیوں اتنی جانیں دے کر اور عصمتیں لٹا کر پاکستان بنوایا۔ میرے نزدیک ہمارے مسائل کا حل صرف توبہ میں ہے۔ انفرادی توبہ یہ ہے کہ اپنے کردار سے خلاف شریعت کاموں کو نکال دیا جائے۔ دوسری ہے اجتماعی توبہ۔ میں سمجھتا ہوں کہ اللہ تعالیٰ کی رحمت جوش میں آجائے گی اور قوم یونسؑ کی طرح اللہ تعالیٰ ہماری توبہ قبول فرمالے گا۔ قوم یونسؑ پر عذاب کے آثار شروع ہو گئے تھے لیکن انہوں نے توبہ کی اور اللہ نے ان پر سے عذاب ٹال دیا۔

⌘⌘⌘

شیعہ سنی اتحاد کی اہمیت اور اس کا واحد حل

دین نام ہے اللہ کی حاکمیت اعلیٰ کو تسلیم کرنے اور اس کے پیارے رسول ﷺ کی لائی ہوئی شریعت پر عمل کرنے کا۔ اگر اس اصول کو مسلمانوں کے تمام مکاتب فکر دل و جان سے قبول کرلیں تو ہمارے معاشرے میں تفرقے کا نام ونشان مٹ جائے گا۔ البتہ اختلاف کی گنجائش بہرحال موجود رہے گی۔ اس اختلاف کو نبی اکرم ﷺ نے اپنی امت کے لئے رحمت قرار دیا ہے۔ یہ اختلاف اہل سنت کے مختلف مسالک اور مذاہب کے درمیان بھی ہے جو نسبتاً کم ہے اور اہل تشیع کے ساتھ اہل سنت کا اختلاف نسبتاً گہرا ہے۔ جہاں تک قرآن کریم کا تعلق ہے یہ دونوں مذاہب کے مابین مشترک ہے اگرچہ اہل سنت حضرات میں یہ شکوک وشبہات پائے جاتے ہیں کہ شیعہ حضرات قرآن کو بھی صحیح نہیں مانتے۔ مولانا منظور نعمانی نے اس موضوع پر بڑی مفصل کتاب بھی لکھی ہے۔ لیکن اہل تشیع حضرات کا عمومی اور مستند مؤقف یہ ہے کہ نہیں ہم اسی قرآن کریم کو برحق مانتے ہیں اور ظاہر ہے کہ ہمیں ان کا وہی مؤقف درست تسلیم کرنا چاہئے جو ان کی زبان سے ادا ہو رہا ہے۔ چنانچہ ''کتاب'' ہمارے اور ان کے مابین مشترک ہے۔ البتہ جہاں تک حدیث کا معاملہ ہے' ان کے اپنے مجموعے ہیں۔ یہاں دونوں مسالک کے درمیان فرق آتا ہے اور اختلاف گہرا ہو جاتا ہے۔ لیکن یہ بھی تفرقہ نہیں ہے۔ تفرقہ تو تب ہوگا' جب سنت کا انکار کیا جائے۔ رسول ﷺ کی مہر نبوت کو توڑا جائے۔ یہاں اختلاف نسبتاً گہرا ہے' کیونکہ جب کسی مسئلے پر گفتگو ہوگی اور استدلال کا معاملہ ہوگا۔ تو دونوں جانب سے حدیثیں پیش کی جائیں گی' جو حدیثیں شیعہ پیش کریں گے۔ وہ اہل سنت کے نزدیک معتبر نہیں ہوں گی اور جو حدیثیں اہل سنت کے نزدیک معتبر اور معتمد علیہ ہیں وہ اہل تشیع کے نزدیک قابل اعتبار نہیں۔ چنانچہ اسی اختلاف کی آڑ میں ملک دشمن طاقتوں نے اپنا کھیل کھیلا ہے اور ملک میں دہشت گردی اور تخریب کاری کرنے کے لئے شیعہ سنی اختلاف کو ایک اہم کمین گاہ اور ڈھال کے طور پر

استعمال کیا ہے اور میں صاف صاف عرض کر دینا چاہتا ہوں کہ یہ معاملہ داخلی نہیں ہے بلکہ اس کے ڈانڈے باہر ہیں۔(Samuel P. Huntington) جو اس وقت امریکہ کا ایک بہت بڑا سیاسی مبصر اور مشیر ہے' اس کے ایک بہت بڑے مقالے "Clash of Civilizations" کا اس وقت دنیا میں بڑا چرچا ہے۔ اس کے نزدیک اب دنیا میں قوموں اور ملکوں کا ٹکراؤ نہیں ہوگا بلکہ تہذیبوں کا ٹکراؤ ہوگا۔ اس نے لکھا ہے کہ اس وقت دنیا میں آٹھ تہذیبیں موجود ہیں' ایک ہماری مغربی تہذیب اور سات دوسری۔ لیکن ان سات میں سے پانچ کو تو ہم آسانی سے اپنے اندر سمو سکتے ہیں اور انہیں ہضم کر سکتے ہیں' لیکن دو تہذیبیں ایسی ہیں کہ وہ ہمارے لئے لوہے کے چنے ثابت ہوں گی' جنہیں چبانا آسان نہیں۔ ایک مسلم تہذیب اور دوسری کنفوشین تہذیب جس کی نمائندگی اس وقت چین کر رہا ہے۔ لہٰذا اس نے دو مشورے دیئے ہیں' ایک یہ کہ چین اور اسلامی ملکوں کو قریب نہ آنے دیا جائے۔ دوسرا مشورہ اس نے یہ دیا ہے کہ مسلمانوں کے باہمی اختلافات کو ہوا دی جائے۔ ایک اعتبار سے ان لوگوں کی جرأت اور دیانت کا مظہر بھی ہے کہ بات صاف اور کھل کر کر رہے ہیں' اپنے تاش کے سارے پتے سامنے رکھ دیئے ہیں کہ تمہارے اندر اگر ہمت ہے تو راستہ روک لو! چنانچہ یہ اس کا مقالہ ہے جو شائع ہوا ہے۔ اور اب سوچیے کہ اس کو بنیاد بنا کر کیا کچھ ہو رہا ہوگا۔ اس حوالے سے ہمارے ہاں دہشت گردی اور تخریب کاری کے ذریعہ شیعہ سنی اختلاف کو ہوا دینے کا معاملہ اس مسئلے کا بہت بڑا پہلو ہے۔ بہرحال کوئی شے موجود ہوتی ہے تو اسی کو دشمن آڑ کے طور پر استعمال کر سکتا ہے' اگر کوئی شے موجود ہی نہ ہو تو اسے آڑ یا ڈھال کیسے بنایا جا سکتا ہے۔

کچھ تو ہوتے بھی ہیں الفت میں جنوں کے آثار
اور کچھ لوگ بھی دیوانہ بنا دیتے ہیں

چنانچہ کچھ نہ کچھ تو ہوتا ہے' تبھی بات بنتی ہے۔ اگر ملک میں شیعہ سنی مفاہمت کی کوئی صورت نکل آئے تو دشمن کی کم از کم ایک کمین گاہ تو ختم ہو سکتی ہے۔ یہ بات شاید آپ جانتے ہوں کہ جب سلطان محمد فاتح کی فوجیں قسطنطنیہ کا محاصرہ کئے کھڑی تھیں تو گرجا میں پادری

آپس میں لڑ رہے تھے اور ان کے مابین ان مسائل پر بحث ہو رہی تھی کہ ایک سوئی کی نوک پر کتنے فرشتے آ سکتے ہیں اور حضرت عیسیٰؑ نے جو روٹی کھائی تھی وہ خمیری تھی یا فطیری؟ اور یہ کہ حضرت مریمؑ حضرت عیسیٰؑ کی ولادت کے بعد بھی کنواری رہیں یا نہیں؟ یہ تین ''عظیم الشان'' مسائل تھے جو اندر زیر بحث تھے اور باہر سلطان محمد فاتح کی فوجیں کھڑی تھیں۔ اور یہی حشر ہمارا ہوا تھا' جب انگریز ہندوستان میں قدم بقدم آگے بڑھ رہا تھا تو ہمارے ہاں یہ بحثیں چل رہی تھیں کہ اللہ جھوٹ بولنے پر قادر ہے یا نہیں؟ اگر نہیں بول سکتا تو ہر شے پر قادر تو نہ ہوا اور اگر بول سکتا ہے تو یہ اس کی شان کے منافی ہے۔ پھر یہ کہ اللہ خود بھی کوئی دوسرا محمد ﷺ پیدا کرنے پر قادر ہے یا نہیں؟ اس وقت مسلمانوں کے چوٹی کے علماء ''امکانِ کذب'' اور ''امتناعِ نظیر'' کی ان بحثوں میں الجھے ہوئے تھے اور انگریز بڑھتا چلا آ رہا تھا۔ وہی حال آج ہمارا ہو رہا ہے کہ ہم اپنی انانیت اور فرقوں کو لئے بیٹھے ہیں' ملکی سلامتی خطرے میں پڑتی ہے تو پڑتی رہے۔ اس مسئلے کا دوسرا پہلو یہ ہے کہ پاکستان کے استحکام کی واحد بنیاد ہی نہیں بلکہ اس کی بقاء کی وجہِ جواز بھی اسلام ہے۔ اگر یہاں اسلام نہیں آتا تو تو اس کے باقی رہنے کا کوئی جواز ہی باقی نہیں رہتا۔ اور یہاں یہ سب کچھ افراتفری' لوٹ کھسوٹ' بدامنی اور عدم استحکام اسی لئے ہے کہ ہم نے اس کی اس واحد وجہِ جواز کو ہی مشکوک بنا دیا ہے۔ نتیجتاً یہ عذابِ الٰہی کے کوڑے ہیں جو ہماری پیٹھ پر پڑتے رہتے ہیں۔ اس ساری پیچیدگی کا واحد حل یہی ہے کہ یہاں اسلام آئے۔ یہاں اسلام اب تک کیوں نہیں آیا' اس کے دو بڑے بڑے اسباب ہیں۔ ان میں سے ایک سبب جو میں بارہا بیان بھی کر چکا ہوں وہ دینی جماعتوں کی یہ بہت بڑی غلطی ہے کہ وہ انتخابی سیاست کے اکھاڑے میں اتر کر پاور پالیٹکس کے کھیل میں شریک ہو گئیں۔ انہیں اقتدار کی غلام گردشوں کے اندر چلنے پھرنے اور وی آئی پی ٹریٹمنٹ کے چسکے پڑ گئے اور یہی شے تھی جو بیڑہ غرق کرنے والی تھی۔ اس وقت میں اس کی مزید کوئی تفصیل بیان نہیں کروں گا۔ یہ میرا وہ مؤقف ہے جو میں بارہا تفصیل سے بیان کر چکا ہوں۔ اس کے علاوہ اس کا دوسرا سبب شیعہ سنی اختلاف ہے جو واقعتاً بہت بڑا اختلاف ہے۔ اس اختلاف کی نوعیت حنفی' مالکی' شافعی والے اختلاف کی سی

نہیں ہے کیونکہ شیعہ اور سنی کے نزدیک سنت رسول ﷺ کے ماخذ جدا جدا ہیں جب کہ دین کی عملی شکل تو سنت ہی سے سامنے آتی ہے ۔

بمصطفیٰؐ برساں خویش را کہ دیں ہمہ اوست!

اب ہم اس مسئلے کے تیسرے پہلو کی طرف آتے ہیں۔ ''نیو ورلڈ آرڈر'' جو درحقیقت ''جیو ورلڈ آرڈر'' ہے اس میں یہ بات طے ہو چکی ہے کہ ہندوستان اور پاکستان دونوں کے ٹکڑے کر دیئے جائیں گے اور ظاہر ہے کہ ''نزلہ برعضو ضعیف'' کے مصداق پہلے پاکستان کی باری ہے۔ ہم نے خود اس کے لئے میدان تیار کر رکھے ہیں کہ آؤ کھیلو اور کودو! بلکہ میں تو اس سے بھی آگے عرض کرتا ہوں کہ یہودیوں کے سامنے امریکہ کے بھی حصے بخرے کرنے کا پروگرام ہے اور وہ اس کے ٹکڑے کر کے رہیں گے۔ وہ اس کو اس وقت تک استعمال کرتے رہیں گے جب تک وہ ان کے مفاد میں استعمال ہوتا رہے اور کسی وقت بھی اگر امریکہ نے ان کی سکیم کے آگے بند باندھنے کی کوشش کی تو جس طرح انہوں نے چشم زدن میں USSR کو دنیا میں نسیاً منسیا کر دیا' اسی طرح وہ USA کے بھی ٹکڑے کر دیں گے' اس لئے کہ پوری معیشت کے لیور پر ان کا ہاتھ ہے۔ لہٰذا ان کی طرف سے ایک حرکت ہوگی' شیئر مارکیٹ کے اندر ایک زلزلہ آئے گا اور امریکہ کی دھجیاں بکھر جائیں گی۔ امریکہ سے زیادہ کمزور (Fragile) معیشت تو دنیا کے کسی دوسرے ملک کی نہیں ہے۔ دنیا میں سب سے زیادہ مقروض حکومت امریکہ کی ہے اور اس کے قرض خواہ یہودی بینکار ہیں۔ اور وہاں کے بینک حکومت کے زیر اثر نہیں ہیں بلکہ آزاد اور حکومت سے بالاتر ہیں' لہٰذا یہودی جب چاہیں امریکہ کو توڑ سکتے ہیں۔ میں تو اس ''جیو ورلڈ آرڈر'' کے بارے میں اپنی کتاب ''سابقہ اور موجودہ مسلمان امتوں کا ماضی' حال اور مستقبل'' میں تفصیل سے لکھ چکا ہوں۔ اس نیو ورلڈ آرڈر یا جیو ورلڈ آرڈر کے آگے اب جو ''آخری چٹان'' باقی رہ گئی ہے وہ پاکستان' ایران' افغانستان اور چینی و روسی ترکستان پر مشتمل مسلمان ممالک کا یہ بلاک ہے۔ یہ وہ آخری چٹان ہے جو یہود کے اس نیو ورلڈ آرڈر کی راہ میں رکاوٹ ثابت ہو سکتی ہے۔ اس کے بعد تو مسلمان ممالک میں سے بنگلہ دیش اور انڈونیشیا وغیرہ باقی رہ جاتے ہیں۔ جو

مشرقِ بعید سے متعلق ہیں' درمیان میں بھارت کا بہت بڑا رقبہ آجاتا ہے جہاں اگرچہ مسلمان بہت بڑی تعداد میں موجود ہیں لیکن وہ وہاں پر مقہور اور مجبور ہیں اور ان کی وہاں پر سیاسی سطح پر کوئی حیثیت نہیں ہے۔ لہٰذا اس اعتبار سے اہم ترین حیثیت اسی بلاک کی ہے اور آپ کو معلوم ہے کہ اس بلاک میں شیعہ سنی تنازعہ سب مسائل سے زیادہ سخت اور گھمبیر ہے۔ اور پاکستان میں اسلام کے نفاذ کی راہ میں سب سے بڑی رکاوٹ بھی یہی ہے اگر اس مسئلہ کا کوئی حل نکل آتا ہے تو اس راستے کی ہماری یہ رکاوٹ دور ہو جاتی ہے۔ اس طرح نفاذِ اسلام کے بعد یہاں اتحاد کی فضا قائم ہوگی اور اگر یہ اتحاد اور مفاہمت ہو جائے تو یہی خطہ وہ چٹان ہے جس سے ٹکرا کر نیو ورلڈ آرڈر پسپا ہو سکتا ہے۔ اگر شیعہ سنی مفاہمت ہو جائے تو (i) ہم یہاں پر دہشت گردی کا ایک بازو توڑ سکتے ہیں۔ (ii) پاکستان میں اسلام کے نفاذ کا راستہ ہموار ہوتا ہے اور اس کے لئے جدوجہد آسان ہوتی ہے۔ (iii) اس خطے کے مسلم بلاک کے اندر اتحاد اور یگانگت عمل میں آسکتی ہے۔ یہ کیسے ممکن ہو سکتا ہے۔ میرے خیال میں اس کا ایک ہی حل ہے اور یہ بات میرے علم میں گزشتہ دورۂ ایران میں آئی کہ اسی فارمولے کو قائد انقلاب ایران جناب آیت اللہ روح اللہ خمینی مرحوم نے ایران میں نافذ کیا اور میری اس تجویز کو موجودہ ایرانی قیادت اور اس وقت کی سب سے بڑی مذہبی شخصیت آیت اللہ خامنہ ای کی مکمل تائید بھی حاصل ہے۔ کاش کہ پاکستان میں اہل تشیع اس حل کو قبول کر لیں! وہ حل یہ ہے کہ جہاں تک عقائد' عبادات' مساجد' فیملی لاز اور وراثت کے قوانین وغیرہ کا تعلق ہے ان میں ہر ایک کو مکمل آزادی ہو کہ وہ اپنی فقہ کے مطابق عمل کرے۔ لیکن ملکی قوانین (Law of the Land) کے معاملے میں صرف اس فقہ کو نافذ کرنے کا اعلان کیا جائے جس کے ماننے والے اکثریت میں ہیں۔ عبادات کا معاملہ ہر ایک پر چھوڑ دیجئے کہ وہ جس طرح چاہے کرے' یہ ایک طرح کا انفرادی معاملہ ہے۔ لیکن جہاں تک ملکی قانون کا معاملہ ہے تو ظاہر ہے کہ وہ ایک ملک میں دو نہیں ہو سکتے' حدود و تعزیرات سب کے لئے الگ الگ نہیں ہو سکتیں۔ اس کے لئے ہمیں ایران سے رہنمائی حاصل کرنی چاہئے۔ وہاں یہ کیا گیا ہے کہ ایران کے دستور میں یہ طے کر دیا گیا کہ ان

معاملات میں اکثریت کی فقہ یعنی فقہ جعفری کے مطابق معاملہ ہوگا۔ اور میں سمجھتا ہوں کہ اس کے سوا کوئی حل ہے بھی نہیں۔ یا تو یہ کہہ دیجئے کہ ہمیں اسلام کی طرف جانا ہی نہیں‘ دین کو اٹھا کر ایک طرف پھینک دو‘ ہمیں تو اپنی فقہ زیادہ پسند ہے...... لیکن اگر دین کو اولیت حاصل ہے اور آپ **لا تتفرقوا فیه** کے قرآنی حکم پر عمل پیرا ہونا چاہتے ہیں کہ دین ایک ہو تو پھر اپنی فقہوں اور اپنے مذاہب ومسالک کو ثانوی درجہ دیجئے۔ یہی کچھ انہوں نے کیا اور میں سمجھتا ہوں کہ اس کا یہی حل ہے جو پاکستان میں بھی قابل عمل ہے چنانچہ پاکستان کے دستور میں یہ طے ہو جائے کہ یہاں فقہ حنفی کو ملکی قانون کی حیثیت حاصل ہوگی کیونکہ یہاں غالب اکثریت احناف کی ہے‘ تاہم اس سے مراد یہ نہیں ہے کہ جو فقہ حنفی آج سے کئی سو سال پہلے مرتب کی گئی تھی وہ جوں کی توں نافذ کر دی جائے گی بلکہ مطلب یہ ہے کہ اب جو اجتہاد ہوگا اور جو قانون سازی ہوگی‘ وہ فقہ حنفی کے اصول فقہ کے مطابق ہوگی۔ یعنی استنباط اور استدلال کے اصول وہی ہوں گے جو فقہ حنفی کے ہیں۔ ایک نئی مقنّنہ (Legislative) ہوگی جسے ہر میدان میں اجتہاد کرنا ہوگا۔ طے یہ کرنا ہوگا کہ قانون سازی میں کتاب وسنت کی حدود سے تجاوز نہیں ہوگا۔ اگر تجاوز ہوتا ہے تو ہر عالم دین کو یہ حق حاصل ہونا چاہئے کہ وہ عدالتِ عالیہ کا دروازہ کھٹکھٹائے اور وہاں جا کر یہ ثابت کرے کہ یہ قانون کتاب وسنت کے خلاف ہے...... یا پھر ایسا ہو کہ یہاں پر کتاب وسنت کی سنی تعبیرات کو دستور میں ثبت کیا جائے اور فقہ جعفریہ کو عبادات میں بشمول زکوٰۃ مکمل آزادی دے دی جائے۔ اگر وہ خود مان جائیں کہ ہم زکوٰۃ کا کوئی ایسا اجتماعی نظام بناتے ہیں کہ حکومت وہی وصول کرے تو کیا کہنے‘ چشم ما روشن دل ما شاد!‘ لیکن اگر وہ اس پر مصر رہیں کہ زکوٰۃ کا معاملہ ان کا پرسنل رہے گا تو بھی ٹھیک ہے‘ اس لئے کہ زکوٰۃ میں عبادت کا عنصر زیادہ غالب ہے اور پرسنل لاء میں عبادات لازمی طور پر آتی ہے۔ نماز‘ روزہ‘ حج اور زکوٰۃ ان سب میں انہیں مکمل آزادی ہونی چاہئے۔ پھر نکاح طلاق اور وراثت کے قوانین کے علاوہ پرسنل لاء میں جتنی چیزیں بھی آتی ہیں ان میں انہیں مکمل آزادی ہو۔ اب آخر میں اپنے اثنا عشری شیعہ بھائیوں کی خدمت میں دست بستہ عرض کرتا ہوں اور مجھے امید ہے کہ میری گزارش صدا بصحرا ثابت نہیں ہوگی

کیونکہ مجھے امید کی کرن نظر آ رہی ہے۔ خدا کے لئے ہر شیعہ بھائی خود بھی سوچے اور اپنی قیادت کی بھی توجہ دلائے کہ وہ پاکستان میں کھلے دل کے ساتھ وہی حیثیت قبول کرلیں جو ایران میں سنیوں کو دی گئی ہے‘ اس طرح ان شاء اللہ پاکستان میں شیعہ سنی اتحاد کی وہ فضا قائم ہوجائے گی جس سے خیر کے سارے راستے کھلتے جائیں گے۔

⌘⌘⌘

علامہ اقبال اور کتابِ زندہ

پاکستان میں بسنے والا ہر مسلمان، قطع نظر اس سے کہ وہ عوام میں سے ہو یا خواص میں سے، بالکل ان پڑھ اور جاہل ہو یا عالم وفاضل، علامہ اقبال کے ساتھ سہ گانہ رشتوں میں منسلک ہے۔ پہلا یہ کہ یہ مملکتِ خداداد سرزمین پاکستان جس میں ہم ایک آزاد اور خودمختار قوم کی حیثیت سے رہ رہے ہیں، اس کا وجود وقیام علامہ ہی کے تخیل وتصور کا مرہونِ منت ہے۔ دوسرے یہ کہ وہ عالمی ملت اسلامی اور اُمت مسلمہ جس سے ہم سب منسلک ہیں، اس کی عظمت وسطوت پارینہ کا سب سے بڑا مرثیہ خواں اور اس کے احیاء ونشاۃ ثانیہ کا سب سے بڑا ترجمان اور حدی خواں بھی اقبال ہی ہے۔ تیسرے یہ کہ وہ دین حق جس کے ہم سب نام لیوا ہیں اور جس کے بارے میں حالی مرحوم نے کہا تھا ؎

جو دین بڑی شان سے نکلا تھا وطن سے
پردیس میں وہ آج غریب الغرباء ہے

اس دور میں خصوصاً جدید تعلیم یافتہ طبقے میں اس دین کے اسرار ورموز کا سب سے بڑا رازدان بھی اقبال ہی ہے اور اس کی روح باطنی اور جسد ظاہری دونوں کے تجدید واحیاء کے عظیم ترین نقیب کی حیثیت بھی اقبال ہی کو حاصل ہے۔ یہ سہ گانہ تعلق تو علامہ مرحوم کے ساتھ ہر پاکستانی مسلمان کو حاصل ہے۔ مجھے ذاتی طور پر ایک چوتھی خصوصی نسبت روح اقبال سے حاصل ہے۔ مجھ پر یہ حقیقت پوری طرح آشکار ہو چکی ہے کہ احیائے اسلام کی شرطِ لازم تجدید ایمان ہے اور ایمان کا اصل منبع اور سرچشمہ قرآن حکیم ہے۔ گویا ملت اسلامی کی نشاۃِ ثانیہ اور تشکیل جدید کی کوشش ہو یا احیائے اسلام اور غلبۂ دین حق کی جدوجہد، دونوں کا اصل منبع ومدار اسی پر وابستہ ہے کہ قرآن حکیم کے ساتھ مسلمانوں کا صحیح تعلق دوبارہ استوار ہو جائے اور اس حقیقی نسبت کی تجدید کی جائے جو ایک مسلمان اور قرآن کے مابین ہونی چاہئے۔ میرے خیال میں ملتِ اسلامیہ اور دینِ حق دونوں کے احیاء اور نشاۃ ثانیہ

کے قرآن حکیم کے ساتھ وابستہ ہونے کا احساس دورِ حاضر میں علامہ اقبال سے زیادہ کسی کو نہ تھا۔ اگرچہ علامہ اقبال بنیادی طور پر سیاستدان نہ تھے لیکن اس کے باوجود انہوں نے برصغیر پاک وہند کے مسلمانوں کے مستقبل کے بارے میں جو کچھ سوچا اور ان کے مسائل کا جو حل پیش کیا وہ ان کی بیدار مغزی، معاملہ فہمی اور سیاسی تدبر کا شاہکار ہے۔ 1930ء سے قبل ہندوستان کی تقسیم کا خیال تک کسی کے ذہن میں نہیں آ سکتا تھا۔ یہ صرف علامہ مرحوم کی نگاہِ دوررس ودُوربین تھی جس نے حالات کے رخ اور زمانے کی رفتار کو پہچان کر مسلمانانِ ہند کے جملہ مسائل کا یہ حل بتایا کہ ہندوستان کے کم از کم شمال مغربی گوشے میں واقع مسلم اکثریتی علاقوں پر مشتمل مسلمانوں کی ایک آزاد اور خودمختار مملکت قائم کی جائے۔ پاکستان کے ساتھ علامہ کا تعلق صرف ''مصور'' کا ہی نہیں بلکہ اس سے کہیں زیادہ ہے۔ ان کی نگاہِ دُور رس نے مسلمانانِ ہند کے قومی مقدمے کی پیروی اور ان کی قیادت عظمیٰ کے لئے صحیح ترین وکیل اور قائد کی حیثیت سے محمد علی جناح کو ڈھونڈ نکالا۔ قائد اعظم کا انتخاب بلاشبہ علامہ اقبال کے خلوص واخلاص کا واضح ثبوت اور ان کے انکسار اور تواضع کی روشن دلیل ہے۔ علامہ اقبال نے صرف پاکستان کا تصور ہی پیش نہیں کیا بلکہ اس خاکے میں رنگ بھرنے کی عملی جدوجہد کے ابتدائی مراحل میں بھی قائدانہ حیثیت سے شرکت کی۔ اس اعتبار سے علامہ کا ایک عظیم احسان ہر اس مسلمان کی گردن پر ہے جو پاکستان کی فضا میں ایک آزاد شہری کی حیثیت سے سانس لے رہا ہے۔ افسوس کہ ہم نے بحیثیت قوم پاکستان ہی کی قدر نہیں کی کجا کہ علامہ اقبال کے اس عظیم احسان کو یاد رکھتے۔ کاش کہ ہم کو علوم ہوتا کہ آزادی اللہ تعالیٰ کی کتنی بڑی نعمت ہے اور یہ مملکتِ خداداد پاکستان کا معجزانہ قیام اللہ تعالیٰ کا کتنا بڑا احسان ہے۔ اسی صورت میں ہمیں علامہ کے ذاتی احسان کا بھی کوئی احساس ہو سکتا تھا مگر ؎

وائے ناکامی متاع کارواں جاتا رہا
کارواں کے دل سے احساسِ زیاں جاتا رہا

ہماری اسی ناقدری کے نتیجے میں پاکستان کا مشرقی حصہ ہم سے علیحدہ ہو گیا۔ اس دردناک حادثہ فاجعہ پر بھارت میں جس طرح خوشی منائی گئی اور اسے جس طرح ''ہزار سالہ

شکست کے انتقام'' سے تعبیر کیا گیا اس سے ان لوگوں کی آنکھیں کھل جانی چاہئیں جو ہندوؤں کے بارے میں کسی حسن ظن میں مبتلا تھے اور ہیں۔ اگر مسز اندرا گاندھی اس نہرو خاندان کی بیٹی ہوتے ہوئے جس کی وسیع المشربی ضرب المثل ہے، یہ الفاظ اپنی زبان سے نکال سکتی ہے تو ''قیاس کن زگلستان من بہار مرا'' کے مصداق سوچنے کی بات ہے کہ فرقہ پرست اور متعصب مزاج ہندو اکثریت کو ایک بار ہندوستان میں فیصلہ کن اقتدار حاصل ہو جاتا تو اس کا رویہ مسلمانوں کے ساتھ کیا ہوتا! علامہ اقبال عالمی ملتِ اسلامیہ کے ترجمان وحدی خواں کی حیثیت سے بھی سامنے آتے ہیں۔ چنانچہ ؎

چین و عرب ہمارا ہندوستاں ہمارا
مسلم ہیں ہم وطن ہے سارا جہاں ہمارا

کا وجد آفریں ترانہ انہی کی زبان پر جاری ہوا۔ علامہ کی ملی شاعری میں مرثیہ خوانی کا رنگ بھی موجود ہے اور حدی خوانی کا نوحہ بھی۔ انہوں نے بیک وقت شبلی اور حالی دونوں کی جانشینی کا فرض ادا کیا اور ملتِ اسلامیہ کے شاندار اور تابناک ماضی کی یاد سے بھی دلوں کو گداز کیا اور اُمت مرحومہ کی موجودہ زبوں حالی کا نقشہ بھی نہایت موثر اور دل دوز انداز میں کھینچا۔ علامہ کی ملی شاعری کا مثبت اور تعمیری پہلو انہیں ملت کے دوسرے مرثیہ خوانوں سے ممتاز کرتا ہے۔ چنانچہ اقبال کے ہاں صرف درد انگیز نالے ہی نہیں ہیں، انتہائی ولولہ انگیز پیغامِ عمل بھی ہے اور سب سے بڑھ کر ایک شاندار مستقبل کی خوشخبری بھی موجود ہے جس نے ''یاس'' اور ''قنوطیت'' کی ظلمت کا پردہ چاک کر کے دلوں میں اُمید کے چراغ روشن کر دیئے۔ علامہ کے اشعار میں یہ اُمید افزا پیغام رچا بسا ہوا ہے۔ وہ فرماتے ہیں ؎

نکل کر صحرا سے جس نے روما کی سلطنت کو اُلٹ دیا تھا
سنا ہے یہ قدسیوں سے میں نے وہ شیر پھر ہوشیار ہو گا

اور ؎

اقبال کا ترانہ بانگِ درا ہے گویا
ہوتا ہے جادہ پیما پھر کارواں ہمارا

علامہ کی ملی شاعری جغرافیے کی حدود سے بالکل آزاد ہے اور ان کے اشعار کو پڑھتے ہوئے کسی کے حاشیہ خیال میں بھی یہ بات نہیں آسکتی کہ ان کا قائل کبھی ایک محدود خطہ اراضی میں بسنے والے مسلمانوں کے خصوصی مسائل کے بارے میں بھی غور و فکر کرتا ہو گا۔ ذرا اندازہ تو کیجئے کہ ایک ہندی مسلمان ارضِ لاہور میں بیٹھا کہہ رہا تھا کہ ؎

تہران ہو گر عالمِ مشرق کا جنیوا
شاید کرۂ ارض کی تقدیر بدل جائے

جہاں تک دینِ حق کے اسرار و رموز اور حقائق و معارف ایمانی اور علم و حکمت قرآنی کی ترجمانی کا تعلق ہے، حقیقت یہ ہے کہ اس نسبت سے علامہ اقبال رومیٔ ثانی تھے! انہوں نے مولانا روم کو اپنا شیخ تسلیم کیا اور ''پیر رومی'' کے ساتھ بحیثیت ''مریدِ ہندی'' ان کے مکالمات ان کے کلام کی زینت ہیں بلکہ ایک مقام پر انہوں نے اپنی اس نسبت کا ذکر فخریہ انداز میں بھی کیا ہے ؎

برہمن زادہ رمز آشنائے روم و تبریز است

علامہ اقبال دورِ حاضر کے ''ترجمان القرآن'' قرار دیئے جانے کے مستحق ہیں۔ علامہ خود بھی اس کے مدعی تھے کہ ان کے اشعار پیغام قرآنی ہی کی ترجمانی پر مشتمل ہیں اور اس پر انہیں اس درجہ وثوق اور اعتبار ہے کہ انہوں نے ''مثنوی اسرار و رموز'' کے آخر میں ''عرضِ حال مصنف بحضور رحمۃ اللعالمین'' کے ذیل میں یہاں تک لکھ دیا کہ اگرچہ میرے دل کی مثال اس آئینے کی سی ہے جس میں کوئی جوہر ہی نہ ہو اور اگر میرے پیغام میں قرآن کے سوا کسی اور شے کی ترجمانی ہے تو اے نبی آپ میرے فکر کے ناموس کا پردہ خود چاک فرما دیں اور اس چمن کو مجھ جیسے خار سے پاک کر دیں یہاں تک کہ حشر کے دن مجھے ذلیل اور رسوا کر دیجئے اور اپنی قدم بوسی کی سعادت سے محروم فرما دیجئے۔ دین حق کی جو تشریح علامہ اقبال کے کلام میں نظر آتی ہے اس کے بغرضِ تفہیم تین اجزاء ہیں اور یہ تینوں اجزاء درحقیقت ایک ہی مرکزی نکتے ''نکتۂ توحید'' کی شرح کی حیثیت رکھتے ہیں۔ ع

یہ سب کیا ہیں؟ فقط اِک نکتہ ایمان کی تفسیریں!

اولاً تمدنی اور معاشرتی سطح پر وحدت خالق ہی وہ اساسی تصور ہے جس سے وحدت انسانیت کا نظریہ جنم لیتا ہے جس میں مزید گہرائی وحدت آدم کے تصور سے پیدا ہوتی ہے اور نتیجتاً انسانی حریت واخوت ومساوات کے اصول مستنبط ہوتے ہیں، چنانچہ بحیثیت نظامِ زندگی کے علامہ کے کلام میں بڑی تاکید پائی جاتی ہے۔ وہ مردِ مومن کی شان میں فرماتے ہیں ۔

تمیز بندہ و آقا فسادِ آدمیت ہے
حذر اے چیرہ دستاں سخت ہیں فطرت کی تعزیریں

اسی طرح سیاسی سطح پر توحید الٰہی کے تصور سے یہ بات سامنے آتی ہے کہ حاکمیت صرف خدا کے لئے ہے جب کہ عوام کی حاکمیت پر مبنی سیاسی نظام مجسم شرک اور کفر ہے۔ کتنے سادہ لیکن پُرشکوہ الفاظ میں علامہ نے فرمایا ۔

سروری زیبا فقط اس ذات بے ہمتا کو ہے
حکمراں ہے اِک وہی باقی بتانِ آزری

ثانیاً حاکمیت کے بعد قومیت کا تصور سامنے آتا ہے، چنانچہ موجودہ زمانے میں وطنی قومیت کا جو تصور پوری دنیا میں رائج ہے، حیرت ہوتی ہے کہ علامہ نے اس کی برائی کا احساس کس شدت سے کیا اور اس شجر خبیثہ کی خباثت کا کس قدر صحیح اندازہ لگایا۔ علامہ فرماتے ہیں ۔

ان تازہ خداؤں میں بڑا سب سے وطن ہے
جو پیرہن اس کا ہے وہ مذہب کا کفن ہے
یہ بت کہ تراشیدہ تہذیبِ نوی ہے
غارت گر کاشانہ دینِ نبویؐ ہے
بازو ترا توحید کی قوت سے قوی ہے
اسلام ترا دیس ہے تو مصطفوی ہے
نظارہ دیرینہ زمانے کو دکھا دے

اے مصطفوی خاک میں اس بُت کو ملا دے

یہی معاملہ نظامِ معیشت کا بھی ہے۔ توحید کا اصول جس طرح حاکمیت اور قومیت کے تمام مروجہ وموجودہ تصورات کی کلی نفی کر دیتا ہے، اسی طرح اس میں ملکیت مطلقہ کے مقبولِ عام تصور کی بھی کامل نفی موجود ہے۔ ظاہر بات ہے کہ اگر ''مُلک'' اللہ کا ہے تو ''مِلک'' بھی اللہ ہی کی ہے اور اگر زمین وآسمان اور جو کچھ ان دونوں میں ہے اس سب کا مَلک یعنی بادشاہ اللہ ہے تو یقیناً ان کا ''مالک'' بھی وہی ہے۔

اس دور میں علامہ کی شخصیت عظمت قرآن کے ایک عظیم نشان کی حیثیت رکھتی ہے، اس لئے کہ ایک عام آدمی کا مذہبی عقیدے کے طور پر قرآن مجید کو اللہ کی کتاب ماننا اور بات ہے اور ایک ایسے شخص کا قرآن پر وثوق واعتماد اور ایمان ویقین دوسری بات ہے جو فکرِ انسانی کی تمام وادیوں میں گھوم کر مشرق ومغرب کے تمام فلسفے کھنگال چکا ہو۔ اعجاز قرآن کے بے شمار پہلو ہیں جن کا احاطہ ہر کسی کے لئے ممکن نہیں۔ اس دور میں اعجازِ قرآن کا عظیم ترین مظہر یہ ہے کہ وہ کتاب جسے دنیا کے سامنے آج سے چودہ سو برس قبل حضور ﷺ نے پیش کیا تھا، آج بھی جب کہ مادی علوم انتہائی بلندی کو چھو رہے ہیں اور علم وہنر کی دنیا میں انقلاب آ چکا ہے، نوعِ انسانی کی ہدایت اور رہنمائی کی جملہ ضرورتوں کو پورا کر سکتی ہے! اس کی گواہی علامہ کی زندگی سے ملتی ہے۔ انہوں نے انیسویں صدی میں شعور کی آنکھ کھولی اور وقت کی اعلیٰ ترین علمی سطح پر علم حاصل کیا لیکن بالآخر ان کے ذہن کو سکون ملا تو صرف قرآن حکیم سے اور ان کی علمی پیاس کو آسودگی حاصل ہوئی تو صرف کتاب اللہ سے۔ علامہ فرماتے ہیں ۔

نہ کہیں جہاں میں اماں ملی، جو اماں ملی تو کہاں ملی
مرے جرم خانہ خراب کو ترے عفو بندہ نواز میں

علامہ جب قرآن کا ذکر کرتے ہیں تو صاف محسوس ہوتا ہے کہ ع' قلندر ہرچہ گوید دیدہ گوید' کے مصداق وہ فی الواقع جمال وجلال قرآنی کا مشاہدہ اپنے قلب کی گہرائیوں سے کر رہے ہیں اور جو کچھ کہہ رہے ہیں وہ شنید نہیں، دید ہی پر مبنی ہے بلکہ بسا اوقات ایسے

محسوس ہوتا ہے جیسے ان کا وجود فکری کلامِ پاک کی عظمت کے بارِ گراں سے ”خاشعا متصدعا“ ہوا جا رہا ہے۔ عظمتِ قرآنی کا یہ احساس وادراک ان کے ریشے ریشے میں سرایت کئے ہوئے تھا اور ان کا ہر شعر قرآن کی جلالت اور رفعت کے ترانے گا رہا ہے۔ مسلمانوں کے زوال واضمحلال کا اور اُمتِ مسلمہ کی ذلت وخواری کا سبب علامہ کے نزدیک قرآن سے دوری ہے۔ وہ فرماتے ہیں ۔

وہ زمانے میں معزز تھے مسلماں ہو کر
اور تم خوار ہوئے تارکِ قرآں ہو کر

علامہ کے نزدیک اسی ”کتابِ زندہ“ سے اُمت کا احیاء وابستہ ہے اور اسی پر اُمت کی نشاۃ ثانیہ کا دارومدار ہے۔ گویا مسلمانوں کی حیاتِ تازہ کا انحصار حقیقتاً مسلمان ہونے پر ہے اور ان کے مسلمان ہونے کا دارومدار قرآن حکیم پر ہے۔ علامہ کے نزدیک علم نام ہے علمِ قرآنی کا اور حکمت نام ہے حکمتِ قرآنی کا اور یہی علم وحکمت قرآن ہے جو کسی کے ذہن اور قلب میں رچ بس جائے تو اس کے باطن میں ایک انقلاب برپا ہو جاتا ہے جو بالآخر ایک عالمی انقلاب کو جنم دے سکتا ہے۔ علامہ کے نزدیک ذہن کی تطہیر اور فکر کی تعمیر کا واحد ذریعہ یہ ہے کہ ”اسرارِ دیں“ فاش کئے جائیں اور نوعِ انسانی کے سامنے ”نکتہ ہائے شرعِ مبین“ کی وضاحت کی جائے، خود تزکیہ نفس، تصفیہ قلب اور تجلیہ روح کا کارگر اور مؤثر ذریعہ بھی قرآن حکیم ہی ہے۔ پاکستان کے بقاء واستحکام، ملتِ اسلامی کی تجدید ونشاۃ ثانیہ اور دینِ حق کے احیاء واظہار جیسے اہم اور جلیل مقاصد کے ضمن میں علامہ اقبال کے فکر اور پیغام کی اشاعت کو بہت اہمیت حاصل ہے اور پاکستانی عوام میں بالعموم اور نوجوان نسل میں بالخصوص جو دُوری رفتہ رفتہ علامہ کی شخصیت اور افکار ونظریات سے پیدا ہوتی جا رہی ہے اسے دور کرنا وقت کی اہم ضرورت بھی ہے اور قومی وملی سالمیت کا تقاضا بھی۔

⌘⌘⌘

ہماری نجات کا واحد ذریعہ: اجتماعی توبہ

سورۃ الفرقان کی آیت 7 میں ارشادِ ربانی ہے: ”سوائے ان کے جنہوں نے توبہ کی اور جو ایمان لائے اور جنہوں نے بالفعل اچھے عمل کئے تو اللہ ان کی برائیوں کو بھلائیوں سے بدل دے گا۔“ دنیا میں کسی قوم کے اللہ کے عذاب سے بچنے کی واحد صورت ”اجتماعی توبہ“ ہے اور اگرچہ یہ واقعہ ہے کہ دنیا میں کسی معاشرے کے صدفی صد لوگ تو کسی بھی دور میں درست نہیں ہوئے۔ (یہاں تک کہ نبی اکرم ﷺ کے زمانے میں بھی آخر دم تک کچھ نہ کچھ تعداد میں منافق ضرور موجود رہے) تاہم اگر کسی قوم کے افراد اتنی معتد بہ تعداد میں سچی توبہ کر لیں کہ پھر اپنی دعوت ونصیحت اور امر بالمعروف ونہی عن المنکر کے ذریعے قوم کے اجتماعی دھارے کا رخ تبدیل کر دیں، یعنی بالفاظ دیگر ایک اجتماعی انقلاب برپا کرنے میں کامیاب ہو جائیں، تو اس قوم کی جانب سے ”اجتماعی توبہ“ کا حق ادا ہو جائے گا۔ یہ گویا از سرِ نو ایمان لانے کا کام ہے، جس کا لازمی نتیجہ عمل کی اصلاح ہے، لہٰذا قوم کی اجتماعی توبہ کے لیے اصل اور بنیادی ضرورت یہ ہے کہ...... اوّلاً افراد واشخاص کی ایک معتد بہ تعداد اللہ کے حضور میں سچی اور خالص توبہ کرے۔ دوئم اپنے عقائد کی تصحیح کرے اور توحید خالص کا دامن ازسرِ نو مضبوطی کے ساتھ تھامے۔ سوئم: فسق وفجور کو ترک کرے اور اپنی معیشت اور معاشرت کو حرام اور منکر سے پاک کرے اور چہارم: غلبۂ اسلام اور قیامِ نظامِ خلافت کی منظّم جدوجہد کے لیے تن من دھن وقف کر دے۔ اس طرح جو منظّم قوت وجود میں آئے، وہ ملکی سیاست اور اقتدار کی کشاکش سے بالکل علیحدہ رہتے ہوئے اپنی جملہ مساعی اور تمام تر توانائیوں کو مزاحمتی تحریک کے لیے وقف کر دے اور امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کے ضمن میں فطری تدریج کے ساتھ ”باللسان“ یعنی زبان اور نشر واشاعت کے دیگر ذرائع سے تدریجاً آگے بڑھ کر ”بالید“ یعنی قوت کے ساتھ مزاحمت کی راہ اختیار کرے اور اس طرح ارضِ پاکستان پر اللہ کے دین کو غالب اور اسلام کے نظامِ عدلِ اجتماعی کو نافذ کرے، اگر ایسا ہو جائے تو اس کے معنی یہ ہوں گے کہ نہ صرف یہ کہ قیامِ پاکستان کے لیے جو قربانیاں مسلمانانِ ہند نے دی

تھیں، وہ رائیگاں نہیں گئیں، بلکہ الف ثانی کی جملہ چار سو سالہ تجدیدی مساعی بھی بار آور ہو گئیں۔ اس لیے کہ اس صورت میں ارض پاکستان کو فوری طور پر اسلام کی نشاۃ ثانیہ کا گہوارہ اور عالمی غلبہ اسلام کا نقطہ آغاز بننے کی سعادت حاصل ہو جائے گی۔

اب ظاہر ہے کہ ہر مسلمان کی دلی خواہش بھی یہی ہوگی کہ ایسا ہو جائے اور اسی کی دعا بھی ہر قلب کی گہرائی سے بلند ہوگی اور ''جب تک سانس تب تک آس!'' کے مصداق ہمیں آخری دم تک کوشش بھی اسی کی کرنی چاہیے لیکن یہ حقیقت بھی اظہر من الشّمس ہے کہ اس کے کچھ ناگزیر لوازم و شرائط ہیں...... اوّلاً: یہ کہ اگرچہ اجتماعی توبہ کا نقطہ آغاز لامحالہ انفرادی توبہ ہی ہوتی ہے، لیکن انفرادی توبہ کے ذریعے صرف اخروی عذاب سے نجات کی ضمانت مل سکتی ہے اور وہ بھی صرف اس صورت میں کہ وہ واقعی ''توبۃ النصوح'' ہو۔ دوئم: یہ کہ آئندہ کے لیے عزم مصمم ہو کہ اس گناہ کا ارتکاب کبھی نہیں کروں گا۔ سوئم: یہ کہ بالفعل بھی اس گناہ کو واقعتاً ترک کر دے اور جو کسی کا حق غصب کیا تھا، اس کی تلافی کرے یا بصورت دیگر اس سے معافی حاصل کرے (ورنہ قیامت کے دن حساب کتاب کے وقت ظالم کی نیکیاں مظلوم کو دی جائیں گی یا مظلوم کی برائیاں ظالم کے حساب میں شمار ہوں گی)۔

انفرادی توبہ خواہ کتنی ہی سچی ہو اور انسان ذاتی اعتبار سے خواہ کتنا ہی متقی و صالح اور عابد و زاہد کیوں نہ بن جائے، اگر قوم کی مجموعی حالت تبدیل نہ ہو اور وہ بحیثیت مجموعی عذاب خداوندی کی مستحق بن جائے تو جس طرح چکی میں گیہوں کے ساتھ گھن بھی پس جاتا ہے، اسی طرح جب کسی قوم پر دنیا میں اجتماعی عذاب آتا ہے تو اس کی لپیٹ میں بدکاروں اور بدمعاشوں کے ساتھ ساتھ بے گناہ لوگ بھی آ جاتے ہیں، جیسا کہ سورۃ الانفال کی آیت 25 میں ارشاد خداوندی ہے: ''اور ڈرو اس عذاب سے جو تم میں سے صرف بدکاروں اور گناہ گاروں پر نہیں آئے گا اور جان لو کہ اللہ سزا دینے میں بہت سخت ہے۔''

نیک اور صالح افراد کے عذاب خداوندی سے بچا لیے جانے کی واحد استثنائی صورت کا ذکر بھی سورۃ التوبہ کی آیت 112 میں آیا ہے: ''توبہ کرنے والے، بندگی کا حق ادا کرنے والے، اللہ کی حمد کرنے والے، لذات دنیوی سے کنارہ کش رہنے والے، رکوع

کرنے والے، سجدہ کرنے والے نیکی کا حکم دینے والے اور بدی سے روکنے والے اور اللہ کی حدود کے محافظ بن کر کھڑے ہو جانے والے''...... اگر ان کی جملہ مساعی کے باوجود قوم بحیثیت مجموعی صحیح رخ پر نہ آئے اور اعراض اور استکبار پر مصر رہنے کے باعث عذاب الٰہی کی مستحق ہو جائے تو اللہ اپنے ایسے ''نہی عن المنکر'' کرنے والے بندوں کو دنیا کے رسوا کن عذاب سے بچا کر اپنے دامن رحمت میں لے لیتا ہے۔ اجتماعی توبہ کے لیے تجدید ایمان کی عمومی تحریک ''رجوع الی القرآن'' شروع کرنے کی ضرورت ہے۔ یہی وجہ ہے کہ علامہ اقبالؒ نے امت مسلمہ کے جملہ امراض کا اصل سبب قرآن سے دوری قرار دیا اور اس کا علاج ''رجوع الی القرآن'' تجویز کیا، چنانچہ جواب شکوہ میں ارشاد فرمایا:

وہ زمانے میں معزز تھے مسلماں ہو کر
تم خوار ہوئے تارک قرآں ہو کر

اور نہایت پر شکوہ الفاظ میں ان فارسی اشعار میں بیان کیا:

خوار از مہجوری قرآں شدی
شکوہ سنج گردش دوراں شدی
اے چو شبنم بر زمین افتندہ
در بغل داری کتاب زندہ!

یعنی ''اے امت مسلمہ! درحقیقت تو خوار اور زبوں حال صرف اس لیے ہوئی کہ قرآن حکیم سے اپنا تعلق توڑ بیٹھی۔ گردش دوراں کے شکوے خواہ مخواہ کر رہی ہے۔ اے وہ قوم جو شبنم کی طرح زمین پر پڑی ہوئی ہے۔ اب بھی اس ''کتاب زندہ'' کی جانب رجوع کر لے جو تیری بغل میں موجود ہے، تو تیرے تمام امراض کا مداوا ہو جائے گا اور جملہ مسائل حل ہو جائیں گے، گویا جس طرح خلیل جبران نے کہا تھا: ''عقل سے روشنی حاصل کرو اور جذبے کے تحت حرکت کرو!'' اسی طرح ہماری ''اجتماعی توبہ'' کا نسخہ یہ ہے کہ ''قرآن سے ایمان حاصل کریں اور ایمان کے روغن سے جہد و عمل کی شمعیں روشن کریں!'' اللہ ہم سب کو اس کی توفیق عطا فرمائے۔

⌘⌘⌘

نبی اکرم ﷺ سے ہمارے تعلق کی بنیادیں

امت مسلمہ اس وقت جس صورتحال سے دوچار ہے اس کی تفصیل میں جانے کی چنداں ضرورت نہیں ہے ہر صاحب نگاہ آگاہ ہے کہ عزت اور وقار اور سربلندی گویا کہ ہم سے چھین لی گئی ہے اور اللہ تعالیٰ معاف فرمائے واقعہ یہ ہے کہ جیسے مغضوب علیہم قوموں کا نقشہ قرآن مجید میں کھینچا گیا ہے، مختلف اعتبارات سے وہی نقشہ آج ہمیں اپنے اوپر منطبق ہوتا نظر آرہا ہے۔ ہمارے ہاں افتراق ہے، باہمی خانہ جنگیاں ہیں، اختلافات ہیں۔ وحدت امت جو اس وقت بہت مطلوب ہے اس کا شیرازہ بکھر چکا ہے۔ سوال یہ ہے کہ اس صورتحال کا حل کیا ہے؟ اس کے لیے ہم کس سے رجوع کریں؟ اس کا جواب اگر ایک لفظ میں جاننا چاہیں تو وہ یہ ہے کہ خلوص اور اخلاص کا رشتہ اور وفاداری کا تعلق از سر نو اللہ سے، اس کی کتاب سے، اس کے رسول ﷺ سے استوار کیا جائے اور صحیح بنیادوں پر قائم کیا جائے۔ ایک حدیث کی رو سے نبی اکرم ﷺ نے فرمایا: دین تو بس خیر خواہی اور خلوص اور اخلاص اور وفاداری کا نام ہے۔ پوچھا گیا کہ حضور ﷺ کس کی وفاداری، کس سے خلوص و اخلاص؟ حضور ﷺ نے ارشاد فرمایا: اللہ سے، اس کی کتاب سے، اس کے رسول ﷺ اور مسلمانوں سے اور مسلمانوں کے رہنماؤں اور قائدین سے اور عامۃ المسلمین سے۔ اللہ تعالیٰ کے ساتھ خلوص واخلاص کا جہاں تک تعلق ہے۔ وہ ایک لفظ میں ادا کیا جا سکتا ہے۔ التزام توحید اور شرک کی ہر نوعیت سے اجتناب اللہ تعالیٰ کے ساتھ وفاداری ہے۔ اگرچہ یہ کام آسان نہیں۔ بقول علامہ اقبال براہیمی نظر پیدا مگر مشکل سے ہوتی ہے ''ہوس چھپ چھپ کے سینوں میں بنا لیتی ہے تصویریں'' جہاں تک قرآن مجید اور نبی اکرم ﷺ کے ساتھ خلوص واخلاص کا معاملہ ہے تو یہ درحقیقت دو چیزیں نہیں ہیں جیسے کہ فرمایا ام المؤمنین حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا نے جب ان سے فرمائش کی گئی کہ ہمیں حضور ﷺ کی سیرت بتائیے تو آپ نے سوال کیا کیا تم قرآن نہیں پڑھتے اور جواب اثبات میں آیا تو

آپ نے فرمایا کہ حضور ﷺ کی سیرت قرآن ہی تو ہے۔ اب ہمیں سوچنا چاہئے کہ نبی اکرم ﷺ کے ساتھ خلوص واخلاص کے تقاضے کیا ہیں۔ آنحضور ﷺ کے ساتھ ہماری وہ نسبت کیسے قائم ہوسکتی ہے جس کے بارے میں علامہ اقبال نے فرمایا ہے ''بمصطفیٰ برساں خویش را کہ دیں ہمہ اوست۔ اگر بہ او نہ رسیدی تمام بولہبیست'' غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ نبی اکرم ﷺ سے ہمارے تعلقات کی بنیادیں چار ہیں۔ سورۃ الاعراف کی آیت ۱۵۷ کا پس منظر بڑا عجیب ہے۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے جب اپنے اور اپنی قوم کے لیے بارگاہ خداوندی میں رحمت کا سوال کیا تو اللہ تعالیٰ نے جواباً ارشاد فرمایا: میری ایک رحمت عام ہے جو تمام مخلوقات کے لیے کھلی ہوئی ہے اور جو میری رحمت خصوصی ہے تو اسے میں نے مخصوص کر دیا ہے ان لوگوں کے لیے جو میرے نبی امیؐ سے اپنا صحیح تعلق قائم کریں گے۔ وہ تعلق کیا ہے؟ اس کو مذکورہ بالا آیت کے آخری حصے میں بیان کر دیا گیا ہے۔ (ترجمہ) جو لوگ ان پر ایمان لائیں گے، ان کی تعظیم کریں گے، ان کی نصرت وحمایت کریں گے اور جو نور ان کے ساتھ نازل کیا گیا ہے اس کی پیروی کریں گے وہ ہوں گے اصل معنی میں کامیاب اور میری رحمت خصوصی انہی لوگوں کے حصے میں آئے گی، اس آیہ مبارکہ کی روشنی میں غور کیا جائے تو حضور ﷺ کے ساتھ ہمارے تعلق کی چار بنیادیں واضح طو ر پر سامنے آتی ہیں۔ سب سے پہلی بنیاد ہے تصدیق وایمان۔ یہ تصدیق کرنا کہ آپ اللہ کے رسول ہیں ﷺ۔ آپ ﷺ نے جو کچھ فرمایا اپنی طرف سے نہیں فرمایا۔ (ترجمہ) اور ہمارا نبی اپنی خواہش نفس سے نہیں بولتا۔ یہ تو ایک وحی ہے جو ان پر کی جاتی ہے۔ (سورۃ النجم آیات ۳،۴) اب اس ضمن میں یہ جاننا چاہئے کہ اس ایمان اور تصدیق کے دو درجے ہیں۔ ایک زبانی اقرار جس سے انسان اسلام کے دائرے میں آجاتا ہے۔ وہ قانونی ضرورت پوری ہو جاتی ہے جو امت محمد ﷺ میں شامل ہونے کے لیے لازمی اور ضروری ہے لیکن اصلی ایمان دل سے تصدیق کا ہے جب کہ آنحضور ﷺ کی رسالت ونبوت پر دل میں یقین کی کیفیت پیدا ہو جائے تو یہ ہے ایمان مطلوب۔ اس کے بغیر جو دوسرے حقوق ہیں نبی اکرم ﷺ کے وہ ہم ادا نہیں کر سکتے۔ پھر زبانی کلامی تعلق رہے گا جیسے کہ اللہ معاف فرمائے

ہماری ایک عظیم اکثریت کا ہے۔ دوسرا تعلق ہے تعظیم و محبت۔ یہ لازمی تقاضا ہے یقین قلبی کا۔ اگر یہ یقین ہو کہ آپ ﷺ اللہ کے رسول ہیں تو آپ ﷺ کی عظمت کا نقش قلب پر قائم ہو جائے گا۔ آپ ﷺ کی محبت دل میں جاگزیں ہوگی۔ جیسے کہ نبی اکرم ﷺ نے فرمایا: (ترجمہ) تم میں سے کوئی شخص مومن نہیں ہوسکتا جب تک کہ میں اسے محبوب تر نہ ہو جاؤں اس کے اپنے بیٹے سے، اس کے اپنے باپ سے اور تمام انسانوں سے۔ یعنی اگر ایک مومن کے دل میں آنحضور ﷺ کی محبت اپنے تمام اعزہ و اقرباء اور تمام انسانوں سے بڑھ کر جاگزیں ہوئی ہے تو وہ حقیقتاً مومن ہے۔ اس حدیث میں بیٹے اور باپ کے ذکر سے تمام عزیزوں، رشتہ داروں، قبیلوں اور قوموں کا احاطہ کرلیا ہے۔ ان الفاظ میں کوئی ابہام نہیں ہے۔ ایسا نہیں کہ بات واضح نہ ہو بلکہ صاف صاف اور دوٹوک انداز میں ارشاد ہوا ہے کہ حقیقی ایمان کا لازمی تقاضا ہے کہ حضور ﷺ ایک بندۂ مومن کو دنیا کی تمام چیزوں سے محبوب تر ہو جائیں۔ ''ادب گاہیست زیر آسماں از عرش نازک تر۔ نفس گم کردہ می آید جنید و بایزید ایں جا''، تعظیم ظاہری بھی مطلوب ہے اور قلبی بھی۔ اس طرح محبت کا زبانی اظہار بھی ہو اور دل میں بھی جاگزیں ہو اور اس کا سب سے بڑا مظہر ہے حضور ﷺ پر درود بھیجنا جس کے بارے میں یہ بھی فرمایا گیا کہ اگر کوئی شخص اپنی دعا کل کی کل صرف حضور ﷺ پر درود بھیجنے پر مشتمل کر دے تو اس کا مقام اور مرتبہ کہیں زیادہ ہوگا اس سے کہ وہ خود اپنے لیے کوئی سوالات کرتا رہے۔ تیسرا تعلق حضور ﷺ کے ساتھ ہمارا حضور ﷺ کی نصرت و حمایت ہے جو لازمی نتیجہ ہے ان پہلی دو بنیادوں کا۔ وہ ہے آنحضور ﷺ کی اطاعت و اتباع۔ ظاہر بات ہے کہ جب آپ کو اللہ کا رسول مانا تو اب آپ ﷺ کے حکم سے سرتابی چہ معنی دارد۔ آپ کا ہر حکم سرآنکھوں پر ہونا چاہیے۔ البتہ انسان تحقیق کا حق رکھتا ہے کہ واقعتاً محمد رسول ﷺ نے یہ حکم دیا ہے یا نہیں۔ لیکن جب طے ہو جائے کہ یہ آپ ﷺ کا فرمان ہے تو اب چون و چرا کا کوئی سوال نہیں۔ اب تو اطاعت کرنی ہوگی اور اطاعت بھی کیسی؟ وہ اطاعت جس کے بارے میں قرآن مجید میں فرمایا گیا۔ (ترجمہ) پس نہیں تیرے رب کی قسم! یہ لوگ ہرگز مومن نہیں ہیں جب تک کہ اپنے نزاعات میں آپ ﷺ ہی کو حکم نہ مانیں اور جو کچھ

آپ ﷺ فیصلہ فرما دیں اس پر اپنے دلوں میں کوئی تنگی محسوس نہ کریں بلکہ آپ ﷺ کے فیصلے کے آگے پوری دلی آمادگی اور خوشی کے ساتھ سر تسلیم خم نہ کر دیں۔ (سورۃ النساء: ٦٥) یہی بات آنحضور ﷺ نے فرمائی: (ترجمہ) تم میں سے کوئی شخص مومن نہیں ہوسکتا جب تک کہ اس کی خواہش نفس اس ہدایت کے تابع نہ ہو جائے جو میں لے کر آیا ہوں۔ جب اطاعت کے ساتھ محبت کی شیرینی شامل ہو جائے تو اس طرز عمل کا نام ہے اتباع۔ اس کا دائرہ بہت وسیع ہے۔ ظاہر ہے کہ اطاعت تو ان احکام کی ہوگی جو حضور ﷺ نے دیئے ہوں لیکن اتباع ان تمام اعمال و افعال کا ہوگا جس کا صدور و ظہور ہوا نبی اکرم ﷺ سے۔ چاہے اس کو کرنے کا حکم آپ ﷺ نے بالفعل نہ دیا ہو۔ اس اتباع کا قرآن مجید میں جو مقام ہے وہ بھی ملاحظہ فرمائیں۔ سورۃ الآل عمران آیت ۳۱ میں فرمایا: (ترجمہ) اے نبی ﷺ ان سے کہہ دیجئے کہ اگر تم اللہ سے محبت رکھتے ہو تو تم لوگ میرا اتباع کرو اللہ تم سے محبت کرے گا اور تمہاری خطاؤں کو ڈھانپ لے گا۔ اس آیت کریمہ سے اتباع رسول ﷺ کی یہ اہمیت سامنے آتی ہے کہ اللہ سے محبت کا دعویٰ ہے تو جناب محمد رسول اللہ ﷺ کا اتباع لازم و لابد ہے۔ اسی اتباع کا ایک نتیجہ تو یہ نکلے گا کہ اللہ ہم سے محبت فرمائے گا اور دوسرا نتیجہ یہ نکلے گا کہ ہم اس کی مغفرت کے مستحق قرار پائیں گے۔ اس سے زیادہ ایک بندۂ مومن کی خوش بختی اور کیا ہوسکتی ہے کہ وہ اللہ کا محبوب اور اس کی مغفرت کا سزاوار بن جائے۔ چوتھا اور آخری یوں کہئے کہ یہ عروج ہے حضور ﷺ کے ساتھ ہمارے تعلق کا۔ وہ ہے تائید و نصرت۔ حضور ﷺ ایک مشن لے کر تشریف لائے تھے۔ حضور ﷺ کا مقصد بعثت عالمی سطح پر ہنوز شرمندۂ تعبیر ہے۔ ''وقت فرصت ہے کہاں کام ابھی باقی ہے۔ نور توحید کا اتمام ابھی باقی ہے''۔ صحابہ کرام رضی اللہ تعالیٰ عنہم نے دوران خلافت راشدہ اس عمل کو جہاں تک پہنچایا تھا ہم اپنی بے عملیوں کے طفیل وہ اثرات بھی ختم کر چکے ہیں۔ اب تو از سر نو پیغام محمدی ﷺ کی نشر و اشاعت کرنی ہے۔ پیغام محمدی ﷺ کو پہنچانا ہے تمام اقوام و عالم تک اور از سر نو اللہ کے دین کو فی الواقع قائم و نافذ کرنا ہے پوری کرۂ ارضی پر اور اس کے لیے پہلے اللہ جہاں بھی توفیق دے، جس خطہ ارضی کی قسمت جاگے اس ملک کی خوش بختی اور خوش نصیبی پر تو واقعتاً

رشک کرنا چاہئے۔ یہ ہے وہ فریضہ منصبی جو امت کے حوالے کیا گیا ہے۔ آنحضور ﷺ کا مشن زندہ وتابندہ ہے۔ حضور ﷺ گویا کہ اب بھی پکار رہے ہیں۔ (ترجمہ) کون ہے اللہ کی راہ میں میرا مددگار۔ یعنی کون ہے جو میرے پیغام کی نشرواشاعت کا کام کرے۔ میرے دین کو علمبردار بن کر کھڑا ہو اور پورے کرہ ارضی پر اس کا جھنڈا سربلند کرنے کے لیے تن من دھن لگانے کے لیے آمادہ ہو جائے۔ اسی ضمن میں آخری بات آتی ہے اس آیہ مبارکہ میں کہ اس عمل کا ذریعہ کیا ہے۔ محمد رسول اللہ ﷺ نے جو انقلاب برپا کیا اس کا آلہ انقلاب قرآن حکیم تھا: ''اتر کر حرا سے سوئے قوم آیا۔ اور اک نسخہ کیمیا ساتھ لایا'' (ترجمہ) وہی اللہ ہے جس نے امیوں کے اندر ایک رسول خود انہی میں سے اٹھایا جو انہیں اس کی آیات سناتا ہے۔ ان کی زندگی سنوارتا ہے اور ان کو کتاب اور حکمت کی تعلیم دیتا ہے۔ پس معلوم ہوا کہ آپ ﷺ کی دعوت کا مرکز ومحور قرآن حکیم تھا۔ آپ ﷺ نے لوگوں کی ذہنیتیں بدلیں تو قرآن حکیم سے۔ لوگوں کی سوچ میں انقلاب برپا کیا تو اسی قرآن حکیم سے۔ ذہن کی تطہیر فرمائی تو اس قرآن کی آیات بینات سے۔ تزکیہ نفس فرمایا تو اسی قرآن کی آیات بینات اس کا ذریعہ بنیں۔ خارج و باطن سے منور ہوئے تو اسی قرآن حکیم کے نور سے۔ وہ کتاب موجود ہے اور اسی کے اتباع کا ان الفاظ میں ذکر ہوا۔ (ترجمہ) اور اس نور کا اتباع کیا جو ان (نبی ﷺ) کے ساتھ اتارا گیا۔ وہ نور جو آپ ﷺ کے ساتھ نازل کیا گیا۔ وہ نور حضور ﷺ حوالے کر کے گئے۔ وہ امت کے پاس ہے۔ اس کے ساتھ اپنے تعلق کو درست کرنا ہے۔ یہ آنحضور ﷺ کے ساتھ ہمارے صحیح تعلق کی آخری اور اہم ترین بنیاد ہے۔ یہ وراثت محمدی ﷺ ہے۔ اس کو مضبوطی سے تھامنے کا حکم ہے اور اسی کو حبل اللہ قرار دیا گیا ہے۔ یہی کتاب اللہ امت کے اندر از سرنو اتحاد ویکجہتی پیدا کرے گی۔ اس سے وحدت فکر پیدا ہوگی۔ اس سے وحدت عمل پیدا ہوگا۔ اس سے ہماری جدوجہد، یکجہتی کے ساتھ اپنے اصل ہدف کی طرف آگے بڑھے گی۔ اس کتاب کے حقوق کو پہچاننا ہمارے حقیقی وقلبی ایمان کے لیے ضروری ولابدی ہے۔ یہی اصل لمحہ فکریہ ہے۔ اس کو از سرنو سمجھیں اور محمد رسول اللہ ﷺ کی لائی ہوئی کتاب مبارک کے ساتھ اپنی نسبت کو پوری درستگی کے ساتھ بہ تمام وکمال از سرنو

استوار کریں۔ اس کتاب کو مانیں جیسا کہ ماننے کا حق ہے۔ اسے پڑھیں جیسا کہ اس کے پڑھنے کا حق ہے، اس کو سمجھیں جیسا کہ اس کے سمجھنے کا حق ہے۔ اس پر عمل کریں جیسا کہ اس پر عمل کرنے کا حق ہے اور پھر اس کے مبلغ، داعی اور معلم بن جائیں جیسے کہ اس کی تبلیغ، دعوت، تعلیم اور تبیین کا حق ہے۔ اللہ تعالیٰ ہمیں ان جملہ امور پر عمل کی توفیق عطا فرمائے تاکہ ہم نبی اکرم ﷺ کے مشن کی عالمی سطح پر تکمیل کے لیے صحیح سمت میں پیش قدمی کر سکیں۔

⌘⌘⌘

انسانوں سے اللہ تعالیٰ کا واحد مطالبہ

نائن الیون کے واقعہ کے بعد عالمی حالات بالخصوص عالم اسلام کے حالات کے حوالے سے ایک مسلمان کے ذہن میں یہ سوال بجا طور پر پیدا ہو گیا ہے کہ ان حالات میں ہمیں کیا کرنا چاہئے؟ چنانچہ اس ضمن میں موجودہ عالمی اور ملکی حالات کا تجزیہ یا اس پر تبصرہ اگرچہ اپنی جگہ بہت اہم ہے۔لیکن ہمارے اور آپ کے لیے سب سے زیادہ اہم امر یہ ہے کہ ہماری اخروی نجات کس شے میں ہے! ہمارے اردگرد حالات چاہے خراب سے خراب تر ہو جائیں،لیکن اگر ہم اللہ کے ہاں نجات پا جائیں تو ہم کامیاب ہیں۔اس کے برعکس اگر اسلام کا بہترین نظام بھی قائم ہو جائے لیکن ہم بےعمل رہیں اور اللہ کے ہاں کامیاب نہ ہوں تو ہم لازماً ناکام کہلائیں گے۔

چنانچہ سب سے اہم مسئلہ یہ ہے کہ پہلے اپنے آپ کو بچایا جائے۔اسی لیے قرآن مجید میں سورۃ المائدہ کی آیت 105 میں فرمایا: جس سے کچھ غلط فہمی بھی بعض لوگوں کو ہو گئی تھی کہ: ''اے ایمان والو! اپنی جان کا فکر تم پر لازم ہے۔کسی اور کا گمراہ ہونا تمہیں کوئی نقصان نہیں پہنچا سکتا، اگر تم راہِ ہدایت پر ہوئے۔'' چنانچہ حضرت ابوبکرؓ نے اپنے ایک خطبہ میں کہا کہ: ''میں دیکھ رہا ہوں، لوگ اس آیت کے غلط معنی لے رہے ہیں کہ شاید ہمارے اوپر دعوت وتبلیغ کی کوئی ذمہ داری نہیں ہے۔وہ اپنی جگہ ایک فرض ہے، لیکن امکانی حد تک آپ کی تبلیغ اور دعوت کے بعد بھی اگر کوئی سیدھے راستے پر نہیں آتا تو اس کا کوئی وبال آپ پر نہیں ہوگا۔''

اس اعتبار سے انسانوں سے اللہ تعالیٰ کے واحد مطالبے کا اگر ایک لفظ میں خلاصہ نکالا جائے، جیسے کہا جاتا ہے کہ ہاتھی کے پاؤں میں سب کا پاؤں، تو وہ لفظ ہے ''عبادت۔'' سورۃ الذاریات کی آیت میں ارشاد باری تعالیٰ ہے: ''میں نے جنات اور انسانوں کو پیدا ہی اس لیے کیا ہے کہ میری عبادت کریں۔''

تمام انبیاءکرام کی دعوت جو قرآن مجید کی مختلف سورتوں میں بڑی تفصیل سے بیان ہوئی ہے، وہ یہی تھی کہ اللہ کی عبادت کرو، اس کے سوا تمہارا کوئی معبود نہیں۔اس عبادت کے لفظ کو اچھی طرح سمجھنے کی ضرورت ہے۔صدیوں کے زوال اور تنزل کی وجہ سے ہمارے ذہنوں میں یہ تصور قائم ہو گیا کہ عبادت سے مراد محض نماز، روزہ، حج اور زکوٰۃ کی ادائیگی ہے۔یہ تصور نہ صرف محدود بلکہ مسخ شدہ بھی ہے۔

عبادت کا لفظ عبد سے بنا ہے۔عبد غلام کو کہتے ہیں۔فارسی میں اس کے لیے لفظ بندہ ہے۔بندہ یا غلام دراصل اپنے آقا کی ملکیت ہوتا ہے۔اس کے کوئی حقوق نہیں ہوتے۔اسے ملازم پر قیاس نہ کریں۔ملازمت تو مقررہ اور محدود اوقات کے لیے کافی ہوتی ہے، جس میں کام کی نوعیت کا بھی تعین کر دیا جاتا ہے جبکہ غلامی ہمہ وقت اور ہمہ جہت ہوتی ہے۔جو حکم دیا جائے اسے پورا کرنا لازم ہوتا ہے۔غلام کو آقا اگر رہنے کے لیے کوٹھڑی اور سونے کے لیے چارپائی دے دے تو وہ ان اشیاء کا مالک نہیں بن جاتا۔

آج ہم پر غلامی اور بندگی کا یہ مفہوم واضح نہیں ہے۔اس میں کوئی شک نہیں کہ نماز، روزہ، حج، زکوٰۃ عبادات ہیں لیکن وہ کون سی عبادت ہے جس کے لیے انسان کو پیدا کیا گیا۔ہم نماز چوبیس گھنٹے تو نہیں پڑھتے رہتے، روزے بارہ مہینے تو نہیں رکھتے، حج ہر سال تو نہیں کرتے! ہمہ تن اور ہمہ وقت عبادت دراصل دو چیزوں سے عبارت ہے۔پہلی چیز کلی اطاعت ہے۔فارسی میں اس کا ترجمہ بندگی ہے۔لیکن ایک بندگی مجبوری کی حالت میں ہوتی ہے۔مصر میں بنی اسرائیل کی حالت کو بیان کرنے کے لیے قرآن مجید میں دو جگہ ''عبادت'' کا لفظ آیا ہے۔جب حضرت موسیٰؑ اور حضرت ہارونؑ فرعون کے دربار میں تشریف لائے تو اس نے بڑے مضحکہ خیز انداز میں کہا کہ ''ان کی قوم تو ہماری عابد (عبادت گزار) ہے۔'' یہاں لفظ عبادت بمعنی اطاعت ہی استعمال ہوا ہے۔لیکن یہ جبری اور زبردستی کی اطاعت تھی۔اللہ کی اطاعت، عبادت تب بنے گی جب یہ دلی آمادگی سے اور محبت کے جذبے سے کی جائے۔جب ہم انگریز کے غلام تھے تو اگرچہ اس کی اطاعت کرنے پر مجبور تھے لیکن اس سے محبت ہرگز نہیں کرتے تھے۔لہٰذا اللہ کی عبادت میں اطاعت

اورمحبت دونوں چیزیں شامل ہوں گی۔ حافظ ابن قیمؒ نے عبادت کی جو تعریف کی ہے، اس کے مطابق عبادت دو چیزوں کو جمع کرنے سے بنتی ہے: اللہ سے انتہا درجے کی محبت اور انتہا درجے میں اللہ کے سامنے بچھ جانا۔

یہ ہے اللہ کا ہم سے تقاضا! گویا ایک لفظ عبادت کے اندر سبھی کچھ پنہاں ہے! اب یہ جان لیجئے کہ عبادات یعنی نماز، روزہ، حج، زکوٰۃ کا اس کلی بندگی یا عبادت سے کیا تعلق ہے۔ اس عظیم عبادت کے لیے دراصل ہمیں کوئی مدد چاہیئے۔ کسی مدد کے بغیر ہم اس عبادت کے تقاضے پورے نہیں کرسکتے۔ مثلاً ہم نے ایک دفعہ تو طے کرلیا کہ میں اللہ کا بندہ ہوں اور اس کی بندگی کروں گا، لیکن پھر ہم بھول گئے اور نفس کی بندگی شروع کردی، کسی فرعون کی اطاعت کرنے لگے۔ چنانچہ اپنے آپ کو یاد دلاتے رہنے کے لیے نماز ہے۔ ہر رکعت میں اياك نعبد واياك نستعين کے ذریعے تجدید عہد ہو رہی ہے۔ پھر عبادت رب کے خلاف سب سے بڑے دشمن یعنی نفس کو کنٹرول میں رکھنے کے لیے روزہ دیا۔ مال کی محبت کم کرنے کے لیے زکوٰۃ وصدقات فرض کیئے اور ان ساری برکتوں کو حج میں جمع کردیا۔ یہی وجہ ہے کہ فرمایا گیا، جس کا حج اللہ کے ہاں قبول ہو گیا اس کے سارے پچھلے گناہ معاف ہو جاتے ہیں اور وہ ایسے ہو جاتا ہے، جیسے آج ہی اس کی ولادت ہوئی ہے۔ ایسا اس لیے ہے کہ حج میں ذکر بھی ہے، احرام کی حالت میں نفس کے اوپر پابندیاں بھی ہیں، اس میں بہت سا پیسہ خرچ ہوتا ہے اور جسم پر مشقت بھی آتی ہے۔ چنانچہ یہ عبادات اصل میں اس بڑی عبادت کے لیے ہمیں تیار کرتی ہیں۔ یعنی اللہ تعالیٰ سے ذاتی تعلق پیدا کرتی اور شعور بندگی کو قائم دائم رکھتی ہیں۔

یہ بھی جان لیجئے کہ یہ عبادت اور اطاعت درحقیقت ہمہ تن، ہمہ وقت، ہمہ وجوہ درکار ہے۔ جزوی (Partial) فرمانبرداری کو اطاعت نہیں کہا جاسکتا۔ اللہ کی عبادت تب ہی ہو گی جب اللہ کے تمام احکام مانے جائیں گے۔ اگر اللہ تعالیٰ کے کچھ احکام مانے جائیں اور کچھ کو چھوڑ دیا جائے تو تجزیہ کرنے پر معلوم ہو گا کہ جن احکام کی تعمیل کی گئی وہ ہمارے نفس کو پسند تھے جبکہ نفس پر بوجھ بننے والے احکام نظر انداز کر دیئے گئے۔ لہٰذا دونوں حالتوں میں ہی درحقیقت نفس کی اطاعت کی گئی، اللہ کی نہیں۔ سورۃ البقرہ میں تمام انسانوں سے خطاب

کرتے ہوئے فرمایا گیا ترجمہ: ''عبادت کرو اپنے اس رب کی جس نے تمہیں بھی پیدا کیا اور تم سے پہلوں کو بھی پیدا کیا تا کہ تم بچ جاؤ۔'' یہاں ''تم سے پہلوں کو بھی پیدا کیا'' ذکر اس لیے کیا گیا کہ دنیا میں سب سے بڑی گمراہی یہی رہی کہ فلاں چیز ہمارے آباؤ اجداد سے چلی آرہی ہے۔ تو کیا آباؤ اجداد گمراہ نہیں ہو سکتے تھے! یہ کوئی دلیل نہیں ہے۔ حتمی چیز صرف اللہ کی عبادت اور اس کے رسول کی سنت ہے۔ اسی کو اختیار کر کے دنیا میں اللہ کی نافرمانی سے جبکہ آخرت میں اللہ کے عذاب سے بچا جا سکتا ہے۔ اس بات کو مثبت طور پر سورۃ البقرۃ کی آیت 208 میں کہا گیا ترجمہ: ''اے ایمان کے دعویدارو! اسلام میں پورے کے پورے داخل ہو جاؤ۔''

یہاں 33 فیصد سے کامیابی نہیں ہو گی بلکہ اللہ تعالیٰ کی سو فیصد اطاعت درکار ہے۔ ایسا نہ کرنے کی صورت میں منفی انداز اختیار کرتے ہوئے سورۃ البقرۃ کی آیت 85 میں شدید ترین وعید آئی ہے: ''کیا تم ہماری اس کتاب کے ایک حصے کو مانتے ہو اور ایک حصے کو نہیں مانتے!'' مثلاً نماز پڑھتے ہو، لیکن سود سے باز نہیں رہتے جس کے بارے میں اللہ نے کہا ہے کہ اس میں ملوث فرد کے خلاف میری اور میرے رسول کی طرف سے اعلان جنگ ہے۔ یہ تضاد اللہ تعالیٰ کی اطاعت کا مذاق اڑانے کے مترادف ہے۔ آگے فرمایا:

''تو نہیں ہے سزا ان کی جو یہ حرکت کریں تم میں سے سوائے اس کے کہ دنیا کی زندگی میں ذلیل و خوار کر دیئے جائیں (جو کہ آج ہم ہیں) اور قیامت کے دن وہ شدید ترین عذاب میں جھونکے جائیں گے۔''

لہٰذا زبان سے اسلام کا دعویٰ کرنے والے لیکن عملی طور پر اللہ کے احکام میں سے کچھ کو ماننے والے اور کچھ کو پاؤں تلے روند دینے والے شدید ترین عذاب کے مستحق ہوں گے۔ آیت کے آخر میں فرمایا گیا: ''اور اللہ غافل نہیں ہے تمہارے اعمال سے۔'' یعنی وہ تمہارے ظاہری حلیوں سے دھوکہ نہیں کھائے گا۔ یہ بات واضح ہونے کے بعد اب موجودہ حالات پر آیئے۔ اس وقت ایک تو وہ مسلمان ہیں جنہیں شریعت کی فکر نہیں ہے، یا اگر ہے تو محض نماز، روزے کی ادائیگی تک۔ ان کی معاش اور معاشرت میں اسلام کہیں دکھائی نہیں

دیتا۔لیکن اس بحث سے قطع نظر فرض کیجئے کہ ایک شخص شریعت پر امکانی حد تک سو فیصد بھی عمل کر رہا ہے۔ چنانچہ وہ سود میں بھی براہ راست ملوث نہیں ہے۔ شراب کا کبھی قطرہ تک نہیں چکھا۔ رشوت کبھی نہیں لی......لیکن اس کے باوجود اس کی اطاعت نامکمل اور عبادت ناقص ہے۔ کیوں؟ دراصل جس نظام کا میں اور آپ حصہ ہیں وہ باطل کا نظام ہے۔ ہمارا سیاسی نظام سیکولر ہے۔ اللہ کے احکام اور اس کی شریعت نافذ نہیں ہے۔ معاشی نظام سارے کا سارا سود، جوئے اور لاٹری پر مبنی ہے۔ ملک میں فحاشی پھیل گئی ہے۔ ہم سب اس ماحول کا حصہ ہیں۔ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

''کہ ایک زمانہ آئے گا جب کوئی شخص سود نہیں کھائے گا لیکن پھر بھی اس کا غبار اور دھواں اس کے اندر جائے گا۔''

دیکھئے یہاں کس قدر حکیمانہ الفاظ استعمال کئے گئے ہیں یعنی اگر ہوا آلودہ ہو جائے تو کیا آپ سانس نہیں لیں گے! تنفس کے ذریعے غبار لامحالہ پھیپھڑوں میں جائے گا جو پھیپھڑوں کے لیے نقصان دہ ہے۔ اسی طرح آج گندم کے ہر دانے کے اندر سود ہے کیونکہ اس کا بیج سودی قرضے سے خریدا گیا، اس کے لیے کھاد، کیڑے مار ادویات، ٹریکٹر اور ٹیوب ویل کی تنصیب سودی قرضے سے ہوئی۔ یہ ہے وہ الجھاؤ کہ آج اپنے ذاتی افعال میں شریعت پر سو فیصد کاربند شخص بھی اجتماعی زندگی میں باطل نظام کی اطاعت کر رہا ہے۔ اس حوالے سے سورۃ المائدہ کے ساتویں رکوع میں تین مقامات پر ایک لفظ کے فرق کے ساتھ اللہ تعالیٰ کا واضح فیصلہ موجود ہے۔ آیت 44 میں ارشاد ہوا: ''اور جو کوئی فیصلہ نہ کرے اس کے مطابق جو کہ اللہ نے اتارا، سو وہی لوگ ظالم ہیں۔''

آیت 47 کے مطابق: ''اور جو کوئی فیصلہ نہ کرے اس کے مطابق جو کہ اللہ نے اتارا، سو وہی لوگ فاسق ہیں۔''

اس کا حل کیا ہے؟ ایک شخص اکیلا نظام تو بدل نہیں سکتا۔ کہیں اور بھی اسلام قائم نہیں ہے کہ وہاں ہجرت کر سکے۔ اس کے لیے ایک لفظ ہے کفارہ۔ جیسے بعض گناہوں کا کفارہ ادا ہو جاتا ہے۔ جس گناہ میں ہم زندگی بسر کر رہے ہیں اس کا کفارہ کیا ہے؟ سب سے پہلے تو

اس نظام کو ذہناً تسلیم مت کیجئے بلکہ اس سے شدید نفرت رکھیے۔ حدیث میں اس شدید نفرت کا نام جہاد بالقلب ہے۔ پھر اس نظام کو (Serve) نہ کیجئے۔ جیسے اس کی عدلیہ میں جج غیر اسلامی قانون کے مطابق فیصلے دے رہے ہیں۔ سول سروس اور فوج اسی نظام کو Serve کر رہی ہے۔ اس کے بعد اس باطل نظام کے تحت اپنا نام پیدا کرنے اور دولت و جائیداد کے حصول تگ و دو نہ کیجئے۔ یہ تین تو منفی امور ہیں۔ مثبت طور پر یہ کیجئے کہ اپنی زندگی کو احتجاج کے انداز میں گزاریں۔ اپنی ضروریات زندگی کو کم سے کم کرتے ہوئے اپنے وقت اور توانائی کو مزید پیسہ کمانے کے بجائے اس نظام کو تلپٹ کر کے اللہ کے نظام کو قائم کرنے کی جدوجہد میں لگائیے۔ یہ کفارہ ہو جائے گا۔ اگر ایسا نہیں ہے تو ہم اس نظام یعنی اللہ کے باغیوں کے ساتھی ہیں۔ سورۃ المائدۃ کی آیت 68 میں واضح طور پر فرما دیا گیا کہ:

''(اے نبیؐ!) کہہ دیجئے کہ اے کتاب والو، تم کسی راہ پر نہیں جب تک قائم نہ کرو تورات اور انجیل کو اور جو تم پر تمہارے رب کی طرف سے اترا۔''

نظام باطل کے تحت زندہ رہنا بھی حرام ہے اگر ہم اس کو بدلنے اور اس کی جگہ نظام حق قائم کرنے کی جدوجہد نہ کر رہے ہوں۔ اس حرام حلال کے تصور کو سمجھئے۔ دیکھئے کوئی شخص سور کھا رہا ہے تو کہیں گے کہ یہ سور حرام ہے۔ دوسری طرف ایک شخص مرغی کا گوشت کھا رہا ہے، لیکن وہ مرغی اس نے کسی کی جیب کاٹ کر خریدی تھی۔ اب بتائیے وہ حلال کھا رہا ہے یا حرام؟ اس طرح ڈاکوؤں کے کسی ڈیرے پر کوئی شخص کھڑا پہرا دے رہا ہے۔ وہ حرام کھا رہا ہے یا حلال؟ اس اعتبار سے باطل نظام کے تحت سانس لینا بھی حرام ہے جب تک کہ آپ اس کے خلاف اور نظام حق کو قائم کرنے کے لیے کوشش نہ کریں۔ دراصل اسلام کے اجتماعی نظام کو عملاً قائم کر دینا اللہ نے ہم پر فرض نہیں کیا بلکہ اس کے لیے کوشش یا جدوجہد کو بنیادی دینی فریضہ قرار دیا ہے۔ اسی طرح اس فرض کی ادائیگی کے ضمن میں خود کو دھوکہ نہ دیں کہ ہم تبلیغ کر کے یا کوئی دارالاشاعت قائم کر کے غلبہ و اقامت دین کی جدوجہد کا حق ادا کر رہے ہیں۔ یہ جدوجہد ایک منظّم جماعت کے بغیر ممکن نہیں ہے کیونکہ نظام کو بدلنے کا مطلب انقلاب لانا ہے اور انقلاب ان چھوٹے موٹے کاموں سے نہیں آ سکتا۔

خون دیئے بغیر انقلاب آ سکتا تو حضرت محمد ﷺ کا انقلاب بغیر قطرہ خون کے ہوتا۔ اسی طرح جان لیجئے کہ یہ کوئی اضافی نیکی کا کام نہیں بلکہ لازمی بنیادی فریضہ ہے، یعنی جہاں نظام باطل ہے وہاں اس نظام کے خلاف جدوجہد بندہ مومن پر فرض ہے۔ اگر یہ باتیں آپ پر واضح ہوگئی ہوں تو اب یہ کام آپ کا ہے کہ آپ کوئی جماعت تلاش کریں۔ جماعت کے بغیر یہ کام ہو ہی نہیں سکتا۔ جن انبیائے کرام کو جماعت یعنی رفقائے کار نہیں ملے، وہ کوئی نظام قائم کیے بغیر ہی دنیا سے چلے گئے۔ حضرت موسیٰؑ کے پاس چھ لاکھ کی نفری تھی، لیکن جب جنگ کا وقت آیا تو ان میں سے صرف دو آدمی نکلے۔ لہٰذا کسی جماعت کا ہونا لازم ہے۔

لوگ کہتے ہیں کہ اتنی زیادہ جماعتیں ہیں، ہمیں کیا پتا کون سی ٹھیک جماعت ہے۔ اس کا سادہ سا جواب یہ ہے کہ جوتا خریدنے کی ضرورت ہو تو آپ یہ کہہ کر بیٹھ تو نہیں جاتے کہ بارہ دکانیں ہیں، پتا نہیں کہاں ٹھیک ملتا ہے۔ اس کے بجائے آپ بازار جاتے ہیں اور قیمتوں کا موازنہ کر کے جوتا خریدتے ہیں۔ اگر آپ نے یہ سمجھ لیا کہ اللہ کے نظام کو قائم کرنا فرض عین ہے۔ اور یہ فرض جماعت کے بغیر ادا نہیں ہو سکتا تو جماعت تلاش کرنا آپ کا فرض ہے۔ اگر کوئی جماعت نہیں ملتی تو خود کھڑے ہو کر جماعت بنانا آپ پر فرض ہوگا۔ جیسے نماز وضو کے بغیر نہیں، اقامت دین کا فرض جماعت کے بغیر نہیں۔ یہ جماعت بھی بیعت کے اصول پر قائم ہونی چاہئے۔ سب سے پہلے تو اس جماعت کا واضح اعلان یہ ہو کہ اس کا نصب العین نظام کی تبدیلی ہے۔ اگرچہ اسلام کی دعوت، تبلیغ، دینی کتب کی اشاعت اور فی سبیل اللہ تقسیم، ناظرہ اور حفظ قرآن کے مدرسے بنانا، دارالعلوم قائم کرنا سب کام اچھے ہیں لیکن یہ بات صریحاً بیان کر دینی چاہئے کہ ہمارا اصل مدعا اور مقصد اس باطل نظام کو تلپٹ کرنا اور اس کی جگہ پر اسلامی نظام قائم کرنا ہے۔ اس جماعت کا ڈسپلن نہایت مضبوط ہونا چاہئے۔ اس مقصد کے لیے بہترین طریقہ بیعت سمع و طاعت کا ہے۔ جس کا ذکر حدیث میں بھی ہے۔ اس ضمن میں بخاری اور مسلم دونوں میں حضرت عبادہ بن صامتؓ سے مروی ایک تفصیلی روایت کا ذکر ملتا ہے۔ اس جماعت کے قائدین سے پوچھنا چاہئے کہ آپ اسلام کو کس طریقے سے نافذ کرنا چاہتے ہیں! باطل کے نظام کو ختم کرنے کے لیے کون سا راستہ

اختیار کیا جائے گا؟ بعض لوگوں کے نزدیک یہ مقصد الیکشن کی ذریعے حاصل کیا جا سکتا ہے۔ پھر ایسے مخلص لوگ بھی ہیں جو اسلام کے لیے جانیں دے رہے ہیں۔ انہیں آج کل دہشت گرد کہا جا رہا ہے۔ لیکن تجربہ بتاتا ہے کہ ان طریقوں سے کوئی مستقل اور پائیدار تبدیلی ممکن نہیں۔ ہمارے نزدیک اسلام کے نظام کو قائم کرنے کا طریقہ صرف سیرت محمدیؐ سے ماخوذ ہونا چاہئے۔ اس جماعت کی قیادت کے قریب جا کر دیکھئے کہ اس سے خلوص کی خوشبو آتی ہے یا دنیاداری کا دھندا معلوم ہوتا ہے! قیادت کا اخلاص اور خلوص بہت ضروری ہی، کیونکہ پیچھے چلنے والوں میں تو ہر طرح کے لوگ ہو سکتے ہیں۔ آنحضور ﷺ کے پیچھے چلنے والوں میں جہاں نہایت مخلص جانثار ساتھیوں کی ایک مضبوط جماعت تھی وہاں کچھ منافق بھی شامل تھے۔

اگر ان چار اعتبارات سے کسی جماعت کے بارے میں آپ کا دل ٹھک جائے تو اس میں شامل ہونا فرض ہے۔ عدم شمولیت سے اس سارے کام کی نفی ہو جائے گی۔ اگر کوئی جماعت مطلوبہ معیار پر پوری نہیں اترتی اور آپ موجودہ تمام جماعتوں کو مسترد کر دیتے ہیں تو اس کا مطلب یہ ہے کہ آپ کے اپنے ذہن میں کوئی ایسا تصور ضرور موجود ہے جس کے حوالے سے آپ دوسروں کو پرکھ رہے ہیں، لہٰذا آپ خود کھڑے ہوں اور جماعت بنائیں۔ ایک امام، ایک مقتدی ہو تو جماعت کا کم از کم تقاضا پورا ہو جائے گا۔ محنت کیجئے، لوگ آہستہ آہستہ آ جائیں گے۔ آنحضور ﷺ کو ابتدائی دس سال میں صرف سو آدمی ملے تھے۔ حاصل کلام یہ کہ اگرچہ بین الاقوامی حالات، پاکستان کا مستقبل اپنی جگہ بہت اہم موضوعات ہیں لیکن میرے اور آپ کے لیے اصل مسئلہ یہ ہے کہ روز محشر اللہ کی طرف سے یہ شکوہ نہ ہو کہ تم دنیا میں میرے باغیوں کے وفادار رہے تھے کیونکہ اس سے بڑی بغاوت دنیا میں کبھی نہیں ہوئی جو آج ہے۔ آج کی دنیا میں اللہ کو انسانی زندگی سے نکال دیا گیا ہے۔ ہمارے پارلیمنٹ میں، مارکیٹوں کے اندر حتیٰ کہ گھروں میں بھی اللہ تعالیٰ کے احکام کو روندا جا رہا ہے۔ اللہ کے خلاف یہ بغاوت اب بر و بحر میں پھیل گئی ہے۔ اس سے نجات کا صرف ایک راستہ ہے......اس بغاوت کے خلاف بغاوت!

⌘⌘⌘

عیسائی، یہودیت اور اسلام: عقائد کا موازنہ

عیسائی مذہب کے بہت سے بنیادی عقائد میں اسلام سے حیرت انگیز حد تک مماثلت پائی جاتی ہے جبکہ انہی عقائد میں یہودیت اور عیسائیت کے نظریات میں زمین و آسمان کا فرق ہے۔ زیرِ نظر تحریر کے ذریعے مختلف مسائل پر تینوں مذاہب کا نقطۂ نظر پیش کر کے عیسائی بھائیوں کو دعوتِ فکر دینا مقصود ہے کہ وہ غیر جانبدارانہ انداز میں غور وفکر کریں کہ ان کے عقیدے سے قریب ترین کون ہے، یہودی یا مسلمان؟ سب سے پہلے ولادتِ مسیح کا مسئلہ لیجئے، عیسائیوں کا ایمان ہے کہ مسیح کی ولادت کنواری مریم سلام علیہا سے بن باپ کے ہوئی۔ یہی مسلمانوں کا عقیدہ ہے کہ حضرت مسیح علیہ السلام کی ولادت بغیر باپ کے اللہ تعالیٰ کے خصوصی ''کلمۂ کُن'' سے ہوئی۔ سورۃ النساء (آیت ۱۷۱) میں الفاظ آئے ہیں۔ ''بے شک مسیح dابن مریم، اللہ کا ایک رسول ہی تو تھا اور اس کا ایک فرمان تھا جو اس نے مریم کی طرف بھیجا اور ایک روح تھی اللہ کی طرف سے۔'' تو ہمارا عقیدہ عیسائیوں سے قریب تر ہے جبکہ یہودی تو سیدہ مریم (سلامُ علیہا) پر بدکاری کی تہمت لگاتے ہیں اور حضرت مسیح علیہ السلام کو (معاذ اللہ) ولد الزنا قرار دیتے ہیں۔ ان کی جرأتوں کا یہ عالم ہے کہ انہوں نے امریکہ میں "Son of Man" کے نام سے ایک فلم بنائی جس میں واشگاف الفاظ میں کہا گیا کہ:

"Jesus is not son of God; he was son of man. He was not born without any father; he had a father."

یہ پوری فلم گویا ''جادو وہ جو سر چڑھ کر بولے'' کی عملی مصداق ہے۔ انہوں نے عیسائیت، خاص طور پر پروٹسٹنٹ عیسائیت کو جس طور پر فتح کیا ہے اس کا اس سے بڑا مظہر اور کیا ہوگا کہ اس کے گھر میں بیٹھ کر یہ باتیں کہہ رہے ہیں اور ان کے خداوندِ یسوع مسیح کو

گالی دے رہے ہیں کہ وہ حرامی تھا (معاذ اللہ) پھر جناب مسیح علیہ السلام کی شخصیت کو لیجئے۔ یہود کے نزدیک وہ مرتد، کافر، جادوگر اور واجب القتل تھا۔ اس مؤقف میں انہوں نے آج تک کوئی ترمیم نہیں کی۔ اگر آج کے یہودی اس سے اعلانِ براءت کر لیتے تو بات اور تھی۔ اس صورت میں کہا جا سکتا تھا کہ اب ان کی ان نسلوں کو تو بہرحال ان کے اسلاف کے جرائم کی سزا نہیں دی جانی چاہئے۔ لیکن ان کا مؤقف بھی بالکل وہی ہے کہ یسوع جادوگر تھا لہٰذا کافر تھا، اور چونکہ کافر تھا لہٰذا مرتد تھا اور مرتد واجب القتل ہے۔ یہ علماءِ یہود کا فتویٰ ہے۔ اس کے برعکس مسلمانوں کے نزدیک وہ اللہ کے رسول ہیں۔ قرآن مجید نے خود حضرت مسیح علیہ السلام کی زبانی آنجنابؑ کی کیا خوبصورت مدح بیان کی ہے۔ ''اور سلام ہے مجھ پر جس روز میں پیدا ہوا اور جس روز میں مروں اور جس روز زندہ کر کے اُٹھایا جاؤں .... یہ ہے عیسیٰؑ ابن مریم۔'' حضرت مسیح علیہ السلام نے جبکہ وہ ابھی گود ہی میں تھے، لوگوں سے یہ گفتگو کی تھی۔ یہ مسلمانوں کا بھی عقیدہ ہے اور حضرت مسیح علیہ السلام کے پیروکاروں کا بھی۔ حضرت مسیح علیہ السلام کے عظیم ترین معجزات کو ہم بھی مانتے ہیں، وہ بھی مانتے ہیں۔ اس کے برعکس یہودی آپؑ کے معجزات کو جادوگری قرار دیتے ہیں۔ لہٰذا مسیحیوں کو سوچنا چاہئے، غور کرنا چاہئے۔ دوست اور دشمن کو پہچاننا چاہئے۔

پھر رفع مسیح علیہ السلام کے معاملہ کو لیجئے۔ یہودیوں کا مؤقف ہے کہ مسیح مر گیا تھا، اسے ہم نے سولی پر چڑھا دیا تھا، قرآن حکیم میں ان کے الفاظ نقل ہوئے ہیں۔ ترجمہ: ''کہ ہم نے مسیح، عیسیٰ ابن مریم، رسول اللہ کو قتل کر دیا ہے۔'' جبکہ مسلمانوں کا عقیدہ یہ ہے کہ وہ قتل نہیں کئے گئے، زندہ آسمان پر اُٹھا لئے گئے۔ عیسائیوں کا بھی یہی عقیدہ ہے، صرف اس فرق کے ساتھ کہ ان کے نزدیک مسیح علیہ السلام صلیب دیئے گئے، پھر زندہ ہو کر آسمان پر اُٹھا لئے گئے۔ ہمارے نزدیک صلیب دیئے جانے کا سوال ہی نہیں، کیونکہ اللہ کا رسول کبھی صلیب نہیں دیا جا سکتا۔ نبی تو قتل کیا جا سکتا ہے، لیکن رسولوں کے بارے میں اللہ تعالیٰ کا اصول یہ ہے کہ ''اللہ نے یہ بات مقرر فرما دی ہے کہ میں اور میرے رسول لازماً غالب

رہیں گے۔'' چنانچہ سورۃ المائدہ میں یہود کے قتل مسیح علیہ السلام کے دعوے کو نقل کرنے کے فوراً بعد دوٹوک الفاظ میں فرمادیا گیا '' حالانکہ انہوں نے نہ اس کو قتل کیا نہ صلیب پر چڑھایا، بلکہ معاملہ ان کے لئے مشتبہ کردیا گیا۔'' ان کو غلط فہمی میں مبتلا کردیا گیا اور اس غلط فہمی کی وضاحت انجیل برنباس میں ہے کہ حقیقت میں وہی یہودا اسکریوتی جو حضرت مسیح علیہ السلام کے حوارِیین میں شامل تھا اور جس نے سونے کی تیس اشرفیوں کے بدلے مخبری کر کے آپؑ کو گرفتار کروادیا تھا اس کی شکل حضرت مسیح علیہ السلام کی سی بنادی گئی اور اسے آپؑ کی جگہ سولی پر چڑھادیا گیا۔ ﴿ وَلٰكِنْ شُبِّهَ لَهُمْ ﴾ کا مفہوم یہی ہے کہ وہ اپنے خیال میں مسیح علیہ السلام کو مصلوب کررہے تھے لیکن درحقیقت اس بدبخت کو سولی پر چڑھا رہے تھے جس نے کہ غداری کی تھی اور تیس اشرفیوں کے عوض اپنے خداوند یسوع مسیح علیہ السلام کو فروخت کردیا تھا۔ اسے یہودی عدالت سے اس غداری کے انعام میں تیس اشرفیاں ملی تھیں۔ انجیل برنباس میں مزید تصریح ملتی ہے کہ آسمان سے چار فرشتے اُترے جو چھت پھاڑ کر اس کمرے میں داخل ہوئے جس میں حضرت مسیح علیہ السلام عبادت کررہے تھے اور انہیں اُٹھا کر لے گئے۔ یہ تفصیلات کسی حدیث میں ہیں نہ کسی تفسیر میں، بلکہ برنباس کی انجیل میں مذکور ہیں۔ مسلمانوں کی رائے بھی یہی ہے کہ حضرت مسیح علیہ السلام زندہ آسمان پر اُٹھائے گئے اور ان کی رائے بھی یہی ہے۔ فرق صرف یہ ہے کہ ہمارے نزدیک وہ سولی دیئے ہی نہیں گئے، بلکہ ان کی جگہ پر کسی اور کو سولی چڑھایا گیا، جبکہ ان کے نزدیک وہ سولی دیئے گئے، پھر انکا "Resurrection" ہوا یعنی پھر زندہ ہوگئے اور اس کے بعد آسمان پر اُٹھائے گئے۔ لیکن یہودی تو سمجھتے ہیں کہ ہم نے انہیں قتل کردیا، ختم کردیا۔ اس کے بعد حضرت مسیح علیہ السلام کی دنیا میں دوبارہ آمد (Second Coming of Jesus) کا معاملہ لیجئے۔ مسلمانوں کا عقیدہ ہے کہ وہی عیسیٰ علیہ السلام ابن مریم قیامت کے قریب دوبارہ دنیا میں تشریف لائیں گے، عیسائی بھی یہی مانتے ہیں۔ چنانچہ یہ چار عقیدے مسلمانوں اور عیسائیوں کے مابین مشترک ہیں۔ جبکہ ان چاروں میں یہودی ان سے مختلف ہی نہیں، ان

کے متضاد عقائد رکھتے ہیں۔

ایک بات مزید نوٹ کیجئے۔ ہمارے نزدیک بھی نزول مسیح علیہ السلام سے قبل ایک مسیح الدجال آنے والا ہے، ان کے نزدیک بھی Anti-Christ آنے والا ہے اور یہودیوں کی عیاری ملاحظہ ہو کہ انہوں نے عیسائیوں کو یہ باور کرادیا ہے کہ وہ ''انٹی کرائسٹ'' مسلمانوں میں سے ہوگا۔ حالانکہ یہ کسی طرح بھی ممکن نہیں ہے، اس لئے کہ مسلمان تو مسیح علیہ السلام پر ایمان رکھتے ہیں۔ انٹی کرائسٹ (مسیح الدجال) درحقیقت ایک یہودی ہوگا، اس لئے کہ یہودی ایک ''مسیح'' کے منتظر تھے، لیکن حضرت مسیح علیہ السلام آئے تو ان کو مانا نہیں، لہٰذا ان کے نزدیک مسیح کی جگہ ابھی خالی ہے اور یہ اپنے اس مسیح کے منتظر ہیں۔ چنانچہ انہی میں سے کوئی یہودی کھڑا ہو کر مسیح ہونے کا دعویٰ کردے گا۔ جیسا کہ سولہویں صدی عیسوی میں یہودیوں کو ایک شخص کے بارے میں یقین کامل ہوگیا تھا کہ یہی مسیح ہے اور یہ اب اعلان کرنے والا ہے۔ لیکن سلطنت عثمانیہ نے اُسے گرفتار کر کے جیل میں ڈال دیا، جہاں وہ مسلمان ہوگیا اور یہ ہاتھ ملتے رہ گئے۔ اس ضمن میں "History of God" بڑی اہم کتاب ہے جو اس دور میں چھپی ہے۔ اس کی مصنفہ نے لکھا ہے کہ حضرت موسیٰؑ کے بعد یہودیوں کی پوری تاریخ میں اس شخص سے زیادہ محبوب اور ہردلعزیز شخصیت نہیں گزری ہے۔ پھر حال ہی میں ایک اور شخص کا امریکہ میں انتقال ہوا ہے جس کے بارے میں انہیں اُمید تھی کہ یہ مسیح ہے اور اعلان کرنے والا ہے، لیکن وہ مرگیا۔ بہرحال حضرت مسیح علیہ السلام کی دوبارہ آمد سے قبل ایک جھوٹا مسیح، فریبی مسیح، مسیح الدجال (Anti-Christ) لازماً آئے گا اور وہ یقیناً یہود میں سے ہوگا۔ اس کی آمد وہ پانچواں نقطہ ہے جو ہمارے اور عیسائیوں کے درمیان مشترک ہے۔ یہ دوسری بات ہے کہ عیسائی دنیا کو یہودیوں نے یہ بات باور کرادی ہے کہ وہ مسلمان ہوگا۔

اب میں ایک خاص بات اضافی طور پر اپنے عیسائی بھائیوں سے کہنا چاہتا ہوں۔ عالمی سطح پر جو یہودی سازش چل رہی ہے وہ تو اب واضح ہوچکی ہے۔ اس پر کتابیں بھی آچکی

ہیں۔ جنہیں دلچسپی ہو وہ "Pawns in the Game" جیسی کتابوں کا مطالعہ کرلیں۔ اب تو ان کا "Order of Illuminati" بھی پورے کا پورا طشت از بام ہو چکا ہے اور اب یہودیوں کو ان چیزوں کے افشاء سے کوئی اندیشہ بھی نہیں ہے۔ اس لئے کہ وہ اپنے سارے مقاصد حاصل کر چکے ہیں۔ صیہونیت نے عالم عیسائیت کو اپنے پھندے میں گرفتار کر کے اسے اپنا آلہ کار بنا لیا ہے اور اب اسے مسلمانوں کے خلاف استعمال کرنا چاہتی ہے۔ لیکن اس کے علاوہ خاص طور پر پاکستان میں ایک اور معاملہ بھی ہے۔ عالمی صیہونیت (World Zionism) کے علاوہ ایک پاکستان کی دیسی یہودیت (Indigenous Zionism) بھی ہے جس سے میں اپنے پاکستانی مسیحی بھائیوں کو خبردار کرنا چاہتا ہوں۔ میری مراد قادیانیت سے ہے اور جہاں تک میری معلومات ہیں یہ قادیانی پاکستانی مسیحیوں کو استعمال کر رہے ہیں۔ یہ خود تو سامنے آ نہیں سکتے، کیونکہ ملکی قانون ان کی راہ میں رکاوٹ ہے، اگرچہ در پردہ ان کی تبلیغی سرگرمیاں بھی جاری ہیں، کنونشن بھی منعقد ہوتے ہیں، سیٹلائیٹ کے ذریعے سے خطابات بھی آ رہے ہیں، لیکن اس سب کے باوجود قادیانی برملا طور پر کھلم کھلا سامنے نہیں آ سکتے، لہٰذا اپنے مقاصد کے حصول کے لئے انہیں کسی کور (Cover) کی ضرورت ہے، اور اپنی یہ ضرورت پوری کرنے کے لئے انہوں نے یہاں کے عیسائیوں کو ورغلایا ہے۔ لہٰذا مجھے پاکستانی مسیحیوں سے یہ عرض کرنا ہے کہ جہاں وہ عالمی یہودی سازش کا آلہ کار بننے سے بچیں، وہیں اس ''دیسی یہودیت'' سے بھی خبردار رہیں۔ اس کے بارے میں بھی انہیں صحیح صحیح معلومات ہونی چاہئیں۔ چنانچہ ذرا ان کے ساتھ بھی اپنے عقائد کا موازنہ کریں تو اندازہ ہو کہ اختلاف کس درجے زیادہ ہے۔ مسلمانوں کے برعکس قادیانی بھی حضرت مسیح علیہ السلام کی بغیر باپ کے ولادت کے قائل نہیں ہیں، لہٰذا وہ یہودیوں کے قریب تر ہو گئے ہیں یا نہیں؟ محمد حسین نامی ایک شخص جو بہت عرصے تک لاہوری مرزائیت کے انگریزی پرچے "The Light" کا ایڈیٹر رہا تھا، مرزائیت سے منحرف ہو گیا تھا۔ بقول اس کے وہ لاہوریت اور قادیانیت

دونوں سے اعلانِ برأت کر چکا تھا۔ وہ شخص میرے دروس میں بڑے شوق سے بیٹھا کرتا تھا اور میرے لئے وہی القابات استعمال کرتا تھا جو یہ لوگ اپنے بڑے بڑے لوگوں کے بارے میں استعمال کرتے ہیں۔ میرے پاس اس کی وہ کتاب بھی موجود ہے جس میں اس نے میرے لئے وہ القابات لکھے ہوئے ہیں۔ لیکن اس شخص نے جب میرا سورۂ مریم کا درس سنا جس میں میں نے یہ الفاظ استعمال کئے کہ ''جو شخص بھی اس بات کو نہیں مانتا کہ حضرت مسیح علیہ السلام کی ولادت بغیر باپ کے ہوئی ہے وہ قرآن پر ایمان نہیں رکھتا''، تو اس دن کے بعد وہ میرے دروس میں نہیں آیا اور صرف یہی نہیں بلکہ اس نے میرے خلاف پروپیگنڈہ شروع کر دیا، پمفلٹ چھپوا کر تقسیم کئے اور میرے خلاف سازشیں شروع کر دیں، حالانکہ کہنے کو وہ قادیانیت سے تائب ہو چکا تھا۔ لیکن اس کے باوجود وہ اس معاملے میں قادیانیوں کے عقیدے پر قائم تھا۔ پھر قادیانی یہودیوں کی طرح حضرت مسیح علیہ السلام کے رفع سماوی کے بھی قائل نہیں ہیں، بلکہ وہ کہتے ہیں کہ مسیح وہاں سے بھاگ کر یہاں کشمیر آیا اور یہاں مر گیا اور دفن ہو گیا۔ ان کے نزدیک یہاں اس کی قبر بھی موجود ہے۔ قادیانیوں کا یہ مؤقف قرآن کے فلسفہ کے سراسر خلاف ہے۔ جان لیجئے کہ کوئی رسول جان بچا کر نہیں بھاگا کرتا۔ البتہ ہجرت ہو سکتی ہے لیکن رسول کی ہجرت کے بعد یا تو پوری قوم ہلاک کر دی جاتی ہے، یا رسول کو ان کے اوپر فتح حاصل ہوتی ہے، غلبہ نصیب ہوتا ہے، جیسے محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو مکہ پر فتح حاصل ہوئی اور حضرت نوحؑ سے لے کر حضرت موسیٰ d تک جن جن رسولوں نے بھی ہجرت کی ان کی قومیں ہلاک کر دی گئیں۔ اللہ کی سنت تو یہ ہے۔ اس کے برعکس یہ کہنا کہ مسیح وہاں سے جان بچا کر بھاگ کر آ گئے اور یہاں گمنامی میں ان کی موت واقع ہو گئی سراسر غلط ہے۔ معاذ اللہ، ثم معاذ اللہ۔ اللہ کے کسی رسول کی اس سے بڑی توہین اور کیا ہو گی۔ تیسری بات یہ کہ قادیانی حضرت مسیح علیہ السلام کے رفع سماوی کی طرح ان کی دوبارہ آمد کے بھی منکر ہیں۔ اس ضمن میں ان کا عقیدہ یہ ہے کہ اصل میں تو مثیلِ مسیح کو دنیا میں آنا تھا اور وہ آ گیا، مرزا غلام احمد قادیانی کی شکل میں۔ تو اگر تمہارے قول کے مطابق مسیح دجال

اور انٹی کرائسٹ بنتا ہے تو وہ مرزا قادیانی آنجہانی بنتا ہے، اس نے دعویٰ کیا ہے کہ میں مسیح موعود ہوں۔ بہرحال عیسائیوں کو کسی صورت میں قادیانیوں کے ہتھکنڈوں میں نہیں آنا چاہئے۔ مجھے اقبال کا یہ شعر یاد آ رہا ہے۔ ؎

شیاطین ملوکیت کی آنکھوں میں ہے وہ جادو
کہ خود نخچیر کے دل میں ہو پیدا ذوقِ نخچیری

یعنی شکار خود یہ چاہے کہ مجھے شکار کر لیا جائے۔ دراصل اس دیسی یہودیت یا ہندی یہودیت کو ملک خداداد پاکستان سے اس لئے بغض وعداوت ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ملتِ اسلامیہ پاکستان کو توفیق عطا فرمائی کہ اس نے علماء کے اجماع (Consensus) کے ساتھ، قانون اور دستور کے تمام تقاضے پورے کر کے دستوری طور پر ان کی تکفیر کی اور ایسا نہیں ہوا کہ ان کی بات نہ سنی گئی ہو۔ مرزا ناصر احمد کو قومی اسمبلی میں بلا کر پورا موقع دیا گیا کہ وہ اپنے مؤقف کا پوری طرح دفاع کرے۔ اس نے برملا کہا کہ ''ہم مرزا غلام احمد کو نبی مانتے ہیں۔'' اس کے بعد پوری اسمبلی نے یہ فیصلہ کیا کہ اگر یہ اس مؤقف پر قائم ہیں تو دائرہ اسلام سے خارج ہیں۔ لہٰذا وہ ہم سے اس کا انتقام لینا چاہتے ہیں اور اس کے لئے یہاں کے مسیحیوں کو اپنا آلہ کار بنانا چاہتے ہیں۔ اب ہمارے یہاں کے عیسائی بھائیوں کو سوچنا چاہئے کہ وہ کس کے خلاف کس کے آلہ کار بن رہے ہیں؟ ہم تو خود منتظر ہیں حضرت مسیح علیہ السلام کے اور وہ حضرت مسیح علیہ السلام ابن مریم ہوں گے، کوئی مثیل مسیح نہیں۔ قادیانیت کے اسی شوشے کی علامہ اقبال نے ''ابلیس کی مجلس شوریٰ'' نامی نظم میں اس طرح تعبیر کی ہے۔

آنے والے سے مسیح ناصری مقصود ہے
یا مجدد جس میں ہوں فرزندِ مریم کے صفات؟

یہ قادیانیوں کا عقیدہ ہے کہ فرزندِ مریم کی صفات کا حامل مجدد غلام احمد آ گیا ہے، بس اب کسی اور مسیح کو نہیں آنا ہے۔ جبکہ مسلمانوں کا عقیدہ جیسا کہ میں بیان کر چکا ہوں یہ ہے کہ

حضرت مسیح علیہ السلام، عیسیٰ ابن مریم دوبارہ بنفس نفیس دنیا میں تشریف لائیں گے۔ البتہ ان کے نزول سے قبل یہودیوں میں سے ایک مسیح دجال کھڑا ہو گا جسے حضرت مسیح علیہ السلام اپنے ہاتھوں سے مقامِ ''لُد'' پر قتل کریں گے۔ (واضح رہے کہ ''لِڈا'' اسرائیل کا سب سے بڑا ایئر بیس ہے)۔ تو مسیحی بھائیو! یہ ہیں ہمارے عقائد! آپ ہمارے پورے عقائد بے شک نہ مانیں، لیکن مندرجہ بالا گذارشات پر غور تو فرمائیں کہ آپ کے عقیدے سے قریب ترین کون ہے۔ یہودی یا مسلمان؟ اور قادیانی یا مسلمان؟ کم سے کم اتنا تقابلی جائزہ تو ہر شخص لے سکتا ہے۔

⌘⌘⌘

فلسطین کا تاریخی پس منظر اور اس کا ہولناک مستقبل

ڈیڑھ سو برس تک فلسطین یہودیوں سے خالی رہا۔ اس کے بعد ایران کا بادشاہ سائرس منظر عام پر آیا' جس نے عراق پر حملہ کر کے نمرود کو شکست دی اور یہود کو واپس جانے کی اجازت دے دی۔ اس وقت حضرت عزیر علیہ الصلوٰۃ والسلام کی تجدیدی و اصلاحی تحریک کے ذریعے بنی اسرائیل کی purgation کی گئی اور مشرکانہ اعمال سے ان کو پاک کیا گیا۔ معبد سلیمانی کو انہوں نے دوبارہ تعمیر کیا اور اسے Second Temple کا نام دیا۔ اس کے بعد ان پر یونانی حملہ آور ہوئے' سکندر اعظم یہیں سے گزر کر انہیں تہس نہس کرتا ہوا پنجاب تک آیا اور اس کے سپہ سالار سلیوکس کی ان پر حکومت رہی۔ کچھ عرصے بعد رومیوں نے یہاں پر حکومت قائم کر لی۔ البتہ انہوں نے براہِ راست قبضہ نہیں کیا بلکہ وہاں پر مقامی بادشاہتیں رہنے دیں۔ بہرحال اس زمانے میں ایک عظیم مکابی سلطنت قائم ہوئی' جس نے 170 ق م سے لے کر 63 ق م تک پھر بالکل وہی نقشہ دکھا دیا جو حضرت داؤد اور حضرت سلیمان علیہم السلام کے زمانے کا تھا۔ یہ 100 برس ایسے ہیں کہ پورے فلسطین پر یہودیوں کا قبضہ رہا۔ پھر ان کے اندر زوال آیا اور اللہ تعالیٰ نے رومیوں کو ان پر مسلط کیا۔ حضرت مسیحؑ اس زمانے میں مبعوث کئے گئے۔ یہودیوں نے حضرت مسیحؑ کا کفر کیا۔ انہیں 33 یا 34 عیسوی میں اللہ تعالیٰ نے آسمان پر اٹھا لیا۔ اللہ تعالیٰ نے یہود کو یوں سزا دی کہ 70ء میں ایک رومن جنرل ٹائٹس نے ان پر حملہ کیا اور یروشلم کی دوبارہ اینٹ سے اینٹ بجا دی۔ سیکنڈ ٹیمپل گرا دیا گیا۔ 70ء سے آج 2004ء تک 1934 برس سے یہودیوں کا خانہ کعبہ گرا ہوا ہے۔ ٹائٹس نے ایک دن میں ایک لاکھ 33 ہزار یہودی یروشلم میں قتل کئے اور 66 ہزار کو وہ قیدی بنا کر یورپ لے گیا۔ یہودیوں کو فلسطین سے نکلنے کا حکم دے دیا گیا۔ 1917ء تک یہودی فلسطین سے بے دخل رہے ہیں۔ یہ ساری داستان میں نے آپ کو اس لئے بتائی ہے کہ یہودی کہتے ہیں کہ فلسطین کی سرزمین اللہ نے ہمیں دی ہے اور اس پر ہمارا

پیدائشی حق ہے۔ آج بدقسمتی سے لبرل مسلمان' یہاں تک کہ میں حیران ہوں کہ بعض وسیع النظر علماء بھی ان کے اس دعوے کو تسلیم کر رہے ہیں۔ اس کے لئے قرآن کے ان الفاظ کا حوالہ دیا جاتا ہے کہ ''تمہارے لئے یہ ارض مقدس لکھ دی گئی ہے۔'' لیکن اُس وقت یہ چیز اس سے مشروط تھی کہ اگر جہاد کر کے فتح کر لو گے تو یہ تمہاری ہوگی۔ جب انہوں نے جہاد و قتال نہیں کیا تو یہ وعدہ ختم ہو گیا۔ بہرحال ان کا حق نہیں ہے یہاں پر۔ وہ دو ہزار سال پہلے نکال دیئے گئے تھے۔ پوری دنیا میں ان سے شدید نفرت کی جاتی تھی۔ عیسائی یورپ کے اندر انہیں ستایا اور مارا جاتا تھا۔ ان کو شہروں میں داخل ہونے کی اجازت نہیں تھی اور ان کی بستیاں شہروں سے باہر ہوتی تھیں' صرف دو گھنٹے کا وقت مقرر تھا کہ ضروریاتِ زندگی کی خرید و فروخت کے لئے آ جا سکتے ہو۔ یہ حال تھا ان کا! فلسطین پر یہودیوں کے دعوے میں عیسائیوں کا بھی ایک بہت بڑا اور مؤثر حلقہ ان کے ساتھ ہے۔ عیسائیوں کو دو فرقوں یعنی کیتھولکس اور پروٹسٹنٹس میں تقسیم کرنے والے بھی یہودی تھے' ورنہ پہلے سب عیسائی ایک پوپ کو ماننے والے تھے۔ پوپ کے خلاف بغاوت یہودیوں نے کروائی اور سب سے پہلے اس کا ظہور انگلستان میں ہوا۔ انگریزوں نے اپنا چرچ ''چرچ آف انگلینڈ'' کے نام سے علیحدہ کر لیا' جو پوپ کے تحت نہیں تھا۔ سب سے پہلا پروٹسٹنٹ ملک بھی برطانیہ تھا اور وہیں پر یہودیوں نے سب سے پہلا ''بینک آف انگلینڈ'' قائم کیا تھا۔ اس سے پہلے دنیا میں کوئی بینک نہیں تھا۔ کوئی سودی معاملہ نہیں تھا۔ پوپ کے زیر اثر کسی بھی علاقے میں سود کی اجازت نہیں تھی۔ یوں پروٹسٹنٹس یہودیوں کے آلۂ کار بن گئے۔ 100 سال پہلے تک پروٹسٹنٹس کا امام برطانیہ تھا' لیکن دوسری جنگ عظیم کے بعد سے یہ جگہ امریکہ نے لے لی ہے۔ عیسائیوں کا معاملہ یہ ہے کہ ارضِ فلسطین سے ان کا بھی تعلق ہے۔ حضرت عیسیٰؑ جہاں پیدا ہوئے' وہ مقام بیت اللحم ہی تھا۔ پھر جہاں انہوں نے تبلیغ کی' وہ سارا علاقہ فلسطین ہی کا تو ہے۔ پھر عیسائیوں کے قول کے مطابق اسی یروشلم شہر کے اندر انہیں صلیب دی گئی۔ تو عیسائیوں کی نظر میں فلسطین مذہبی اعتبار سے ان کا اہم ترین اور مقدس ترین علاقہ ہے۔ یہی وجہ ہے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے آسمان پر اٹھائے جانے کے ایک ہزار سال بعد انہوں

نے ارض مقدس کو مسلمانوں کے قبضے سے واگزار کرانے کے لئے کروسیڈز شروع کیں۔ان کروسیڈز کے اندر انتہائی خون ریزی ہوئی اور بحیرہ روم کے ساحلی علاقوں میں مسلمانوں کی اکثر بستیاں تباہ و برباد ہوگئیں۔ 1099ء میں عیسائیوں نے یروشلم فتح کر لیا اور وہاں لاکھوں مسلمانوں کو قتل کیا۔ یورپی مؤرخین لکھتے ہیں کہ جب عیسائی فاتحین کے گھوڑے یروشلم میں داخل ہوئے تو ان گھوڑوں کے گھٹنوں تک خون کا دریا بہہ رہا تھا۔مسلمانوں پر ایسا عذاب آیا۔لیکن اللہ کا شکر ہے کہ اٹھاسی سال بعد 1187ء میں اس نے ایک مردِ مجاہد صلاح الدین ایوبی کو اٹھایا۔انہوں نے عیسائیوں کو شکست دی اور یروشلم واپس لے لیا۔اس کے بعد بھی تین چار کوششیں ہوئی ہیں۔کروسیڈز ایک دفعہ نہیں بلکہ کئی دفعہ ہوئے ہیں۔تاہم اب امریکہ کے پروٹسٹنٹ عیسائی کہہ رہے ہیں کہ فیصلہ کن صلیبی جنگ شروع ہونے والی ہے' جب مسلمانوں کے ایک ایک بچے کو فلسطین سے نکال دیا جائے گا اور یہ زمین پاک کر دی جائے گی۔The Philadelphia Trumpet کی اشاعت بابت اگست 2001ء میں اس کے ایڈیٹر کی طرف سے یہ عبارت شائع ہوئی ہے کہ ''اکثر لوگ سمجھتے ہیں کہ صلیبی جنگ ماضی کی بات ہے جو ہمیشہ کے لیے ختم ہو چکی۔لیکن وہ غلط سمجھتے ہیں۔آخری صلیبی جنگ کے لیے تیاریاں ہو رہی ہیں اور وہ سب سی زیادہ خون ریز ہوگی۔''اب مستقبل کیا ہے؟ آئندہ کے حالات سامنے آ گئے ہیں۔سن 70ء سے نکالے ہوئے یہودی جن کی انتہائی persecution ہوئی ہے۔پہلے کروسیڈز میں جہاں مسلمانوں کا قتل عام ہوا ہے' اس کے برابر یہودیوں کا بھی ہوا ہے کیونکہ عیسائیوں کو یہودیوں سے بھی شدید نفرت تھی۔ایک قوم (عیسائی) حضرت عیسیٰ ؑ کو خدا کا بیٹا مانتی ہے جبکہ دوسری (یہود) انہیں حرام زادہ' واجب القتل' کافر اور مرتد ٹھہراتی ہے (نعوذ باللہ)۔تو ان دونوں قوموں میں کوئی مصالحت کیسے ہو سکتی ہے؟ یہ تاریخ کا معجزہ ہے۔یہ یہودیوں کی محنت' جدوجہد' کوشش' سازشی انداز' منصوبہ بندی اور دوراندیشی کا نتیجہ ہے کہ انہوں نے عیسائیوں کو جو یہودیوں خون کے پیاسے تھے اور ان سے انتہائی نفرت کرتے تھے' رفتہ رفتہ دو فرقوں میں تقسیم کر دیا۔پروٹسٹنٹس کو انہوں نے اپنا آلہ کار بنایا اور آج پوری عیسائی دنیا ان کے قبضہ قدرت میں ہے۔

یہودیوں کا ایجنڈا کیا ہے؟ آرمیگاڈان کی ایک خبر دی گئی ہے کہ بہت بڑی جنگ ہوگی۔وہ چاہتے ہیں کہ یہ جلد از جلد ہو جائے' جس کی حدیث میں بھی خبر ہے الملحمۃ الکبریٰ۔تاریخ انسانی کی یہ سب سے بڑی جنگ کئی سالوں پر پھیلی ہوگی۔ یہ جنگ اگرچہ چھوٹے سے علاقے میں ہوگی' لیکن خون ریزی کے اعتبار سے دنیا کی تاریخ کی کوئی جنگ اس کے مساوی نہیں ہوگی۔تو یہود چاہتے ہیں کہ پہلے تو آرمیگاڈان کے نتیجے میں گریٹر اسرائیل قائم ہو جائے۔اس کے لئے کوشش ہو رہی ہے۔ذرا سوچئے کہ امریکہ نے عراق پر کیوں حملہ کیا! ابھی تک کوئی وجہ سامنے نہیں آ سکی۔کوئی وسیع پیمانے پر تباہی پھیلانے والے ہتھیار برآمد نہیں ہوئے۔بعض لوگ کہتے ہیں کہ یہ سب کچھ تیل کے لئے کیا گیا۔قطعاً نہیں! یہ گریٹر اسرائیل کی طرف پہلا قدم ہے۔ 1991ء کی خلیجی جنگ کے اتحادی کمانڈر انچیف نے بعد میں صاف کہہ دیا تھا کہ ''ہم نے اسرائیل کی حفاظت کے لیے جنگ کی۔'' یہودیوں کا دعویٰ ہے کہ ہم نے گریٹر اسرائیل بنانا ہے۔پہلے کہتے تھے کہ فرات تک ہمارا علاقہ ہے' اب کہتے ہیں دریائے دجلہ بھی ہمارا ہے۔سقوط بغداد کے وقت اسرائیلی وزیراعظم شیرون نے صاف کہہ دیا تھا کہ عنقریب عراق پر ہمارا قبضہ ہوگا۔یہ ساری تیاری اس کے لئے ہے۔ یہ یہودی ہیں جو بش اور اس کے ساتھیوں کو چابی دے رہے ہیں۔یہ اچھی طرح سمجھ لیجئے کہ 11 ستمبر 2001ء کا واقعہ کرنے والے بھی یہودی ہیں۔امریکہ میں اب اس بارے میں کوئی تحقیق نہیں ہو رہی کہ 11 ستمبر 2001ء کا واقعہ کس نے کیا تھا! شروع میں کچھ کارروائی ہوئی تھی' لیکن اس کی بعض باتیں لیک ہونے پر معاملہ فوراً ٹھپ کر دیا گیا۔کیونکہ وہ کھرا تو اسرائیل تک پہنچ رہا تھا۔بہرحال یہودیوں کا ایجنڈا یہ ہے کہ سب سے پہلے آرمیگاڈان جلد از جلد ہو جائے جس کے نتیجے میں گریٹر اسرائیل قائم ہو۔وہاں پر وہ اپنا تھرڈ ٹمپل تعمیر کریں گے' جس کے لئے مسجد اقصیٰ اور گنبد صخرا دونوں کو گرایا جائے گا۔پھر وہاں پر تخت داؤد لا کر رکھا جائے گا اور اس پر وہ مسیحا آ کر بیٹھے گا جس کا انہیں انتظار ہے۔پروٹسٹنٹ عیسائی بھی یہی کہتے ہیں کہ آرمیگاڈان جنگ جلد ہو' گریٹر اسرائیل قائم ہو اور تھرڈ ٹمپل بنے۔ پروٹسٹنٹ عیسائیوں اور کیتھولکس کے درمیان مذہب کے نام پر جتنی خون ریزی ہوئی ہے'

دنیا میں کبھی نہیں ہوئی۔ یورپ میں اس پر جس قدر خانہ جنگیاں ہوئی ہیں' اس کا آپ تصور نہیں کر سکتے۔ سارے پروٹسٹنٹس یہاں سے مار مار کر بھگا دیئے گئے' جو امریکہ میں جا کر آباد ہوئے۔ یورپ کا بڑا حصہ کیتھولکس پر مشتمل ہے۔ سپین' اٹلی' فرانس' جرمنی سب کیتھولکس ہیں۔ پروٹسٹنٹس نے امریکہ کے اندر اپنی نئی دنیا بسائی ہے اور وہاں وہ غالب ہیں۔ یہودی اور پروٹسٹنٹ عیسائی برطانیہ اور امریکہ کو نیا اسرائیل کہتے ہیں' اس لئے کہ یہاں انہیں طاقت اور کنٹرول حاصل ہے۔ بہر حال کیتھولکس کی چونکہ پروٹسٹنٹس کے ساتھ دشمنی ہے اس لئے درحقیقت اب یورپ میں آخری صلیبی جنگ کی تیاری ہو رہی ہے۔ یورپ کو دوبارہ متحد کیا جا رہا ہے' جیسے کبھی رومن امپائر ہوتی تھی اور پورا یورپ تقریباً ایک بادشاہ کے تحت ہوتا۔ یہ اصل میں پوپ کی طرف سے کروایا جا رہا ہے تا کہ بہت بڑی رومن کیتھولک امپریلزم قائم ہو سکے۔ نیٹو سے علیحدہ ہو کر یورپ کی اپنی الگ فوج بنانے کی تیاریاں بھی اسی منصوبے کا حصہ ہیں۔ پروٹسٹنٹس کا کہنا یہ ہی کہ کیتھولک عیسائی فلسطین کو فتح کرنا چاہتے ہیں' تا کہ یہودیوں اور مسلمانوں کو ختم کر کے وہاں پر کیتھولک عیسائی ریاست قائم ہو جائے۔

سابقہ امت بنی اسرائیل جن کو اللہ نے کتاب ہدایت اور کتاب شریعت تورات عطا کی تھی' تقریباً دو ہزار برس تک اس دنیا میں اللہ کی نمائندہ قوم کے منصب پر فائز رہی۔ انہیں 1400 قبل مسیح میں تورات عطا کی گئی تھی اور 610 عیسوی میں آنحضور ﷺ کی بعثت تک وہ امت مسلمہ تھے۔ 624ء میں تحویل قبلہ کا حکم اس امر کی واضح علامت اور اعلان تھا کہ سابقہ امت مسلمہ' جس کا مرکز بیت المقدس تھا' اب اپنی اس حیثیت سے معزول کر دی گئی ہے اور جو نئی امت اس مقام پر فائز کی گئی ہے یعنی امت محمدؐ' اس کا مرکز خانہ کعبہ ہے۔ حضور ﷺ کی بعثت تک بنی اسرائیل کی دو ہزار سالہ تاریخ تھی جبکہ تقریباً ساڑھے چودہ سو برس اس امت محمدؐ کے ہیں۔ اس پس منظر میں فلسطین کے حوالے سے ایک بڑا پیارا جملہ میری نظر سے گزرا تھا کہ: Too small geography but too big a history. یعنی فلسطین جغرافیہ کے اعتبار سے تو بہت چھوٹی جگہ ہے' اس کا رقبہ ہماری سابقہ ریاست بہاول پور کے برابر ہے' لیکن تاریخ اس کی پانچ ہزار سال تک پہنچی ہوئی ہے۔ اس کے مانند دنیا کے

کسی علاقے کی تاریخ محفوظ نہیں ہے۔ اس کا آغاز آج سے چار ہزار سال قبل انبیاء کرام کے سلسلے سے ہوتا ہے جب حضرت ابراہیمؑ عراق سے ہجرت کر کے فلسطین میں آئے تھے۔ ان کی قوم کی طرف سے دشمنی کی انتہا یہ تھی کہ آگ میں ڈال دیئے گئے۔ اللہ نے آگ کو حکم دیا تو وہ گل وگلزار بن گئی۔ اس کے بعد حضرت ابراہیمؑ نے فوراً فیصلہ کر لیا کہ اب میں یہاں سے ہجرت کر جاؤں گا۔ یہ اللہ کا قانون رہا ہے کہ جب کسی قوم کی طرف کوئی رسول بھیجا جائے اور وہ قوم اس رسول کی جان لینے پر آمادہ ہو جائے تو پھر اسے ہجرت کی اجازت ہو جاتی ہے۔ حضور ﷺ کے ساتھ بھی یہی معاملہ ہوا تھا۔ چنانچہ حضرت ابراہیمؑ نے فلسطین کو اپنا مسکن اور مرکز بنا لیا۔ ان کے بیٹے حضرت اسحاقؑ کا مقام بھی یہیں رہا۔ پھر ان کے بیٹے یعنی حضرت ابراہیم کے پوتے حضرت یعقوبؑ نے بھی یہیں قیام کیا۔ ان تین انبیاء کے تسلسل کے ساتھ وہاں قیام کو بھی بنی اسرائیل اپنی تاریخ کا حصہ سمجھتے ہیں۔ حضرت یوسفؑ کے زمانے میں بنی اسرائیل مصر چلے گئے اور چار پانچ سو سال تک وہاں رہے۔ اس دوران فلسطین کے ساتھ ان کا کوئی تعلق نہیں رہا۔ بنی اسرائیل کے لئے یہ شدید ترین غلامی اور تعذیب کا دور تھا' جس سے انہیں اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰؑ کے ذریعے سے نجات دلائی۔ پانچ چھ سو سال قبل محض ستر افراد کا جو قافلہ مصر میں داخل ہوا تھا' اب اس کی تعداد چھ لاکھ تک پہنچ چکی تھی۔ وہاں سے حضرت موسیٰؑ اس قافلے کو لے کر فلسطین کی سرحد پر پہنچ گئے اور اپنی قوم کو حکم دیا کہ اب جنگ کے لئے تیار ہو جاؤ اور اس ارض مقدس میں داخل ہو جاؤ۔ لیکن پوری قوم نے کورا جواب دے دیا۔ قرآن مجید میں ارشاد ہے: ''ہم ہرگز داخل نہیں ہوں گے ارض فلسطین میں جب تک کہ جو لوگ آج اس پر قابض ہیں وہ وہاں سے نکل نہ جائیں۔ تو جاؤ تم اور تمہارا رب لڑو' ہم تو یہیں بیٹھے ہیں۔'' اس پر اللہ کا فیصلہ آ گیا کہ: ''انہوں نے بزدلی دکھائی ہے تو ارض مقدس چالیس برس تک ان پر حرام کر دی گئی۔ اب وہ اس زمین کے اندر بھٹکتے اور بھٹکتے پھریں گے۔ (اے موسیٰ!) اب تم افسوس نہ کرو ان فاسقوں کے بارے میں کہ ان کا یہ حشر ہو رہا ہے۔'' ان چالیس برسوں کے دوران حضرت موسیٰ اور حضرت ہارون علیہم السلام کا انتقال ہو گیا۔ وہ ساری نسل جو کہ مصر میں غلام رہی تھی'

ختم ہوگئی۔ نئی نوجوان نسل نے حضرت موسیٰؑ کے جانشین حضرت یوشع ابن نون کی سرکردگی میں رفتہ رفتہ پورا فلسطین فتح کرلیا۔ لیکن ایک بہت بڑی غلطی یہ ہوئی کہ پورے فلسطین پر کوئی ایک مرکزی حکومت قائم نہیں کی گئی۔ بارہ میں سے دس قبیلوں نے اپنی چھوٹی چھوٹی ریاستیں قائم کرلیں جبکہ دو قبیلوں کا تاریخ میں سراغ نہیں ملتا کہ کہاں گئے۔ میری ذاتی رائے یہ ہے کہ وہ بھارت میں آ کر آباد ہوئے۔ یہاں کا برہمن وہی یہودی طبقہ ہے جو اُس وقت برہما یعنی حضرت ابراہیمؑ کا نام لے کر یہاں آیا تھا۔ ''صحف ابراہیم وموسیٰ'' کا قرآن مجید میں دوجگہ ذکر ہے، لیکن وہ آج ہمارے پاس کہیں نہیں ہیں۔ تورات بگڑی تگڑی ہی تو سہی ناں۔ زبور محرف حالت میں سہی، لیکن موجود تو ہے۔ انجیل کیسی بھی ہو، وجود تو رکھتی ہے۔ لیکن آج دنیا میں صحف ابراہیم کے نام سے کوئی کتاب نہیں ہے۔ رائے ہے کہ ہندوؤں کے اپنشد درحقیقت حضرت ابراہیمؑ کے صحیفے ہیں۔ یہ رائے میں نے اپنشد کا کچھ مطالعہ کر کے قائم کی ہے۔ بہرحال انہوں نے دس چھوٹی چھوٹی ریاستیں قائم کرلیں، جو باہم دست وگریباں رہنے لگیں۔ آس پاس کی مشرک قومیں ایک دوسرے کے خلاف ان سے مدد لیتیں۔ ہوتے ہوتے ان قوموں کا اتنا اثر ونفوذ ہوگیا کہ تقریباً پورے فلسطین پر وہ قابض ہو گئے اور ان کو اپنے گھروں سے نکال باہر کیا۔ یہ تین سو برس کی تاریخ ہے جو ان حملوں میں بیان ہوئی ہے۔ پھر انہیں ہوش آیا کہ ہمیں تو جہاد کرنا چاہئے۔ چنانچہ وقت کے نبی سے کہا گیا کہ ایک سپہ سالار معین کر دیں۔ انہوں نے حضرت طالوت کو معین کیا۔ اللہ تعالیٰ نے حضرت طالوت کو جالوت کے مقابلے میں فتح دی۔ یہاں سے یہود کی تاریخ کا زریں باب شروع ہوا، جو میرے نزدیک ان کی خلافتِ راشدہ ہے۔ 1000 قبل مسیح سے لے کر 900 قبل مسیح تک محیط تقریباً 100 برس میں پہلے حضرت طالوت تھے، پھر ان کے داماد حضرت داؤدؑ آئے اور پھر ان کے بیٹے حضرت سلیمانؑ۔ اس کے بعد ان کا ایک دورِ زوال شروع ہو گیا۔ حضرت سلیمانؑ کے دو بیٹوں کے درمیان یہ سلطنت دو حصوں میں تقسیم ہوگئی: شمالی اسرائیل اور جنوبی یہودیہ۔ شمالی سلطنت کا دارالخلافت سامریہ جبکہ جنوبی کا یروشلم تھا۔ آپس کی لڑائی کا نتیجہ یہ ہوا کہ 700 قبل مسیح میں آشوریوں نے اسرائیل کی شمالی سلطنت ختم کر

دی، صرف چھوٹی سی جنوبی یہودیہ رہ گئی۔ پھر ان کے ہاں فسق وفجور کا بازار گرم ہوا تو اللہ تعالیٰ نے عراق کے بادشاہ اور اس وقت کے نمرود نبوکدنضر (بخت نصر) کے ہاتھوں ان پر زبردست عذاب مسلط کیا۔ حضرت سلیمانؑ نے جو معبد (ہیکل سلیمانی) بنایا تھا، اسے مکمل طور پر مسمار کر دیا گیا۔ لاکھوں افراد یروشلم میں موقع پر قتل ہوئے جبکہ چھ لاکھ یہودی مردوں، عورتوں اور بچوں کو قیدی بنا کر بابل لے جایا گیا۔ یہودیوں، رومن کیتھولکس اور پروٹسٹنٹ عیسائیوں تینوں کی نگاہ اس وقت اس چھوٹے سے علاقے پر ہے۔ یہ سارا معاملہ اب ارض فلسطین پر آ گیا ہے۔ اب اس کا حل کیا ہے؟ ایک اصولی اور مبنی برانصاف حل تو یہ ہے جو شروع سے پی ایل او کا مطالبہ تھا اور اب بھی حماس کا مطالبہ ہے کہ اسرائیل کا قیام ناجائز طور پر ہوا تھا، ہمارے اوپر ظلم کر کے یہاں یہودیوں کو آباد کیا گیا اس لئے اسرائیل کو ختم ہونا چاہئے اور پورے کا پورا فلسطین اس کے اصل رہنے والوں کو دیا جائے۔ لیکن اصل فیصلہ تو طاقت کرتی ہے۔ ع ''ہے جرمِ ضعیفی کی سزا مرگِ مفاجات''۔ امریکہ ان کی پشت پر ہے۔ یورپ سے بھی کبھی کبھی امیدیں بنتی ہیں کہ وہ کچھ یہودیوں کے خلاف اور فلسطینیوں کے حق کی بات کر دیتے ہیں، لیکن ان کا بھی اصل ایجنڈا یہی ہے کہ یہاں سی یہودیوں اور مسلمانوں سب کو نکال کر رومن کیتھولک حکومت قائم کی جائے۔ بہرحال یہ صورتِ حال ہے۔ ہمارے ہاں بھی کہا جاتا ہے کہ بھئی زمینی حقائق کو دیکھو۔ ایک زمانہ ہوا کہ پی ایل او نے ہاتھ ڈال دیئے کہ اچھا ٹھیک ہے، اسرائیل بھی رہے لیکن ایک فلسطینی ریاست بھی بن جائے۔ اب اس صورتِ حال کو بھی بارہ تیرہ سال گزر گئے ہیں۔ بظاہر اس مسئلے کا کوئی حل ہے ہی نہیں۔ اس چھوٹے سے جغرافیہ پر اتنے لوگوں کی نگاہیں ہیں اور بے چارہ مسلمان وہاں پر پٹ رہا ہے۔ اگر دیکھا جائے تو موجودہ حالات میں پی ایل او کی بات بھی کسی درجے میں صحیح ہے۔ امریکہ کے سامنے سر جھکانے کے علاوہ اور کیا چارۂ کار ہے! بہرحال دنیا کی تازہ ترین صورتحال کے مطابق آرمیگاڈان اب زیادہ دور نہیں ہے۔ اس کے لئے یورپ بھرپور تیاریاں کر رہا ہے۔ آج کل ایک عجیب بات قبرص کے حوالے سے بھی دیکھنے میں آ رہی ہے۔ کوفی عنان صاحب وہاں بار بار آ رہے ہیں۔ اصل میں نیٹو افواج کا صدر

مقام پہلے جرمنی تھا' وہاں سے یہ کوسوو کی طرف منتقل ہوا۔ اب وہاں سے ان کا اگلا قدم قبرص ہے۔ وہیں اصل ''جمپنگ پیڈ'' بنے گا۔ فلسطین یہاں سے بہت قریب ہے' لہٰذا یہیں سے حملہ ہوگا' اور اس حملے میں اتنی خون ریزی ہوگی کہ اس کا ہم تصور بھی نہیں کر سکتے' کیونکہ جب تک یہود مسجد اقصیٰ اور قبۃ الصخرہ کو نہ گرائیں ان کا تھرڈ ٹمپل نہیں بنتا۔ قبضہ ان کے پاس ہے اور دنیا کی عظیم ترین عسکری قوت ان کی پشت پر ہے۔ اب اس سے بڑی بات کیا ہوگی کہ اسرائیلی وزیر اعظم شیرون نے فیصلہ کیا ہے کہ غزہ کی پٹی پر قائم چند یہودی بستیوں کو تو ہم خالی کر دیں گے' جس کا رقبہ محض 140 مربع میل ہے' لیکن مغربی کنارے پر ہم اپنی بستیاں نہیں گرائیں گے اور وہ یہودی علاقہ ہی رہے گا۔ امریکہ نے بھی اس منصوبے کی منظوری دے دی ہے۔ اس سے آگے یہ معاملہ ہوا ہے کہ صدر حسنی مبارک نے اپنے حالیہ دورہ امریکہ کے دوران بش کو یہ دھمکی دی ہے کہ مشرق وسطیٰ میں امن کا عمل طویل ہونے اور روڈ میپ پر اسرائیل کے کاربند نہ ہونے سے عرب دنیا میں بے چینی اور اضطراب بڑھ رہا ہے۔ عوام یہ صورت حال کب تک برداشت کریں گے! عرب نوجوانوں کے اندر یہودیوں کی نفرت رچی ہوئی ہے۔ لہٰذا وہ اٹھیں گے اور پھر ہولناک قتل عام ہوگا۔ اس میں سب سے پہلے امریکہ کے ایجنٹوں کی صورت میں جو مسلمان حکمران بیٹھے ہوئے ہیں وہ اپنے نوجوانوں کو ختم کریں گے۔ ملت عرب کے لئے انتہائی خون ریز معاملہ آنے والا ہے۔ یہ ہے وہ ہولناک منظر جسے حضور ﷺ نے الملحمۃ العظمٰی' الملحمۃ الکبریٰ یعنی تاریخ انسانی کی عظیم ترین جنگ سے تعبیر کیا ہے۔ مستقبل سوائے اس کے اور کوئی نہیں۔ کوئی راستہ نہیں۔

⌘⌘⌘

خلیج کی حالیہ جنگ............جنگوں کی ماں؟

صحیح بخاریؒ اور صحیح مسلمؒ میں حضرت ابو ہریرہؓ سے روایت ہے کہ نبی اکرمؐ نے ارشاد فرمایا کہ ''گمان ہے کہ فرات سے سونے کا ایک خزانہ برآمد ہو جائے گا'' اور صحیح مسلمؒ میں حضرت ابی ابن کعبؓ سے مروی ہے کہ آنحضورؐ نے ارشاد فرمایا ''گمان ہے کہ فرات سے سونے کا ایک پہاڑ برآمد ہوگا تو جب لوگ اس کے بارے میں سنیں گے تو اس پر ٹوٹ پڑیں گے۔ جو لوگ اس کے پاس ہوں گے وہ سوچیں گے کہ اگر ہم نے انہیں چھوڑ دیا تو وہ ساری دولت لے جائیں گے پھر اس پر جنگ کریں گے یہاں تک کہ ننانوے فیصد لوگ ہلاک ہو جائیں گے'' (ان احادیث کو پڑھتے ہوئے یہ بات پیش نظر رہے کہ قدیم زمانے میں ملکوں اور علاقوں کو دریاؤں یا پہاڑوں یا بڑے شہروں کے نام سے موسوم کرنے کا رواج عام تھا) تو ذرا غور فرمائیں کہ کیا یہ بات محض ''اتفاق'' ہے اور عظمت حدیث کی دلیل نہیں کہ آج تیل کی دولت کو ''سیال سونا'' قرار دیا جا رہا ہے؟ پھر کیا یہ واقعہ نہیں کہ خلیج کی حالیہ جنگ کا اصل باعث یہی تیل کی دولت ہے؟ مزید برآں کیا یہ امر قابل توجہ نہیں ہے کہ عراق کے صدر صدام حسین نے اس جنگ کو ''ام المحارب'' یعنی جنگوں کی ماں یا جنگوں کی سلسلے کا نقطہ آغاز قرار دیا؟ (واضح رہے کہ صدام حسین خواہ اپنی ذاتی حیثیت میں دینی اعتبار سے کتنی ہی ناپسندیدہ شخصیت کی حیثیت رکھتا ہو، بہر حال عرب ہونے کے ناطے قرآن سے بھی واقف ہے اور حدیث نبویؐ سے بھی)۔

یہی وجہ ہے کہ دسمبر 90ء میں میں نے اس کا جو طویل انٹرویو لاس اینجلس میں سی این این پر دیکھا تھا، جو ایک نہایت ماہر و شاطر شخص جان رادر نے لیا تھا، اس موقع پر میں یہ دیکھ کر حیران رہ گیا تھا کہ اس کی پشت پر جو طغریٰ آویزاں تھا وہ سورۃ الانبیاء کی آیت 18 کے اس حصے کا تھا ''بل نقذف بالحق علی الباطل فیدمغہ فاذا ھو زاھق'' یعنی ''ہم حق کا کوڑا باطل کے سر پر دے مارتے ہیں جو اس کے دماغ کا بھرکس

نکال دیتا ہے اور اس طرح باطل نیست و نابود ہو جاتا ہے۔'')

اس وقت یہی صدام حسین امریکہ اور اس کے حواریوں کے حلق میں پھنسی ہوئی ہڈی بنا ہوا ہے کہ نہ اگلی جائے نہ نگلی جائے۔ امریکی صدر بش کے ارادوں اور بیانات سے یہ حقیقت واضح ہو چکی ہے کہ امریکہ اور اس کے حواری ہر ممکن کوشش کریں گے کہ ان کے کسی ایک سپاہی کو بھی کوئی گزند نہ پہنچے خواہ دشمن کا بچہ بچہ ہلاک ہو جائے۔ اس موقع پر اس امر کا ذکر بھی دلچسپی کا موجب ہوگا کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے حواری حضرت یوحنا کے مکاشفات میں بھی، جو بائیبل کے عہد نامہ جدید کی آخری کتاب میں درج ہیں، عراق کی ایسی ہی شدید تباہی کا ذکر موجود ہے۔ ان مکاشفات میں عراق کو ''بڑے شہر بابل'' کے نام سے موسوم کیا گیا ہے اور سب سے حیران کن امر یہ کہ اس ''شہر'' کے تین ٹکڑے ہو جانے کی نہایت واضح الفاظ میں خبر دی گئی ہے۔ (دیکھئے کتاب ''مکاشفات'' کے باب 16 کی آیات 18-19) اور آج یہ حقیقت نگاہوں کے سامنے موجود ہے کہ عراق بالفعل تین حصوں میں تقسیم ہو چکا ہے۔ چنانچہ شمال میں کردستان تقریباً خود مختار ہو چکا ہے اور جنوبی علاقے کو ''نو فلائی زون'' قرار دے کر عملاً عراق کی حکومت کے کنٹرول سے آزاد کر دیا گیا ہے اور صرف بقیہ درمیانی علاقے پر حکومت بغداد کی واقعی عملداری باقی رہ گئی ہے۔ بوسنیا ہرزیگووینا سے شروع ہونے والی صلیبی جنگوں کا سلسلہ افغانستان اور عراق کے بعد کہاں تک پہنچے گا۔ ایک نوجوان محقق کی تحقیق جس کا لب لباب یہ ہے کہ ان جنگوں کے دوران شدید جانی و مالی نقصانات کی صورت میں امت مسلمہ کے افضل اور برتر حصے یعنی مسلمانان عرب کو ان کے اس اجتماعی جرم کی بھرپور سزا مل جائے گی جس کا ارتکاب انہوں نے دین حق کے نظام عدل وقسط کو ایک کامل نظام زندگی کی صورت میں قائم نہ کر کے کیا ہے۔ ان جنگوں میں ایک مرحلے پر ''دارالسلام'' صرف حجاز تک محدود ہو کر رہ جائے گا اور دشمن مدینہ منورہ کے ''دروازوں'' تک پہنچ جائے گا۔ لیکن پھر رحمت خداوندی جوش میں آئے گی، مسلمانان عرب ایک نئی ہیئت اجتماعی تشکیل دیں گے اور ایک نئے قائد امیر محمد ابن عبداللہ المہدی کے ہاتھ پر ''بیعت'' کر کے جوابی کارروائی کے لیے مستعد ہو جائیں گے۔ اس موقع پر یہ تذکرہ

یقیناً دلچسپی کا موجب ہوگا کہ عیسائیوں کی روایات میں بھی اس دنیا کے خاتمے سے قبل ایک عظیم جنگ کا ذکر موجود ہے جو حق اور باطل کے مابین ہوگی۔ چنانچہ حضرت یوحنا کے جن مکاشفات کا تذکرہ اس سے قبل ہو چکا ہے ان ہی میں نہ صرف یہ کہ اس جنگ کا ذکر بھی موجود ہے، بلکہ یہ صراحت بھی ہے کہ اس میں حصہ لینے کے لیے ''مشرق کے بادشاہوں کی فوجیں'' بھی آئیں گی! مکاشفات میں اس جنگ کے دن کو ''خدائے اعظم و قادر کا دن'' کہا گیا ہے اور اس کے محل وقوع کا نام ''آرمیگاڈان'' بتایا گیا ہے۔ (دیکھئے ''مکاشفات'' باب 16 آیات 12 تا 16)۔ گویا حدیث نبویؐ کا ''الملحمۃ العظمیٰ'' اور بائیبل ''آرمیگاڈان'' ایک ہی حقیقت کے دو نام ہیں! احادیث نبویہ سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ ان جنگوں کے پہلے مرحلوں میں مقابلہ صرف عیسائیوں اور مسلمانوں کے مابین ہوگا اور یہودی اگرچہ پس پردہ تو شریک ہوں گے لیکن سامنے نہیں آئیں گے۔ چنانچہ خلیج کی جنگ کے دوران اس صورت حال کی بھی ایک ابتدائی جھلک دنیا کے سامنے آ چکی ہے کہ امریکہ اور اس کے حواریوں نے اسرائیل کو جنگ میں شرکت سے روکے رکھا ہے اور اس کی حفاظت کی ذمہ داری خود پوری کر رہا ہے۔ تاہم جب حضرت مہدی کی قیادت میں اور مشرق سے آنے والی کمک کی مدد سے مسلمانان عرب کامیابیاں حاصل کرنی شروع کریں گے تو یہودی بھی جنگ میں کود پڑیں گے اور یہی مرحلہ ''المسیح الدجال'' کے خروج کا ہوگا...... جس کے ہاتھوں مسلمانوں پر عذاب الٰہی کے کچھ مزید اور شدید تر کوڑے پڑیں گے۔ تاہم اس کے بعد حضرت مسیحؑ نازل ہوں گے اور ان کے ہاتھوں نہ صرف یہ کہ دجال قتل ہوگا بلکہ پوری قوم بنی اسرائیل پر بھی اللہ کا وہ عذاب استیصال نازل ہو جائے گا جس سے وہ اب سے دو ہزار برس قبل حضرت مسیحؑ انکار کر چکے تھے۔ چنانچہ اگرچہ ابتداء میں مسیح الدجال کے ہاتھوں ''عظیم تر اسرائیل'' وجود میں آ جائے گا، تاہم بالآخر وہی عظیم تر اسرائیل'' سابقہ معزول و مغضوب امت مسلمہ کا ''عظیم تر قبرستان'' بن جائے گا۔

⌘⌘⌘

اسرائیل نامنظور کیوں؟

اسرائیل کو تسلیم کرنے کے حوالے سے گذشتہ ادوار میں گاہے بگاہے دبی زبان سے باتیں ہوتی رہی ہیں لیکن پہلی بار ایسا ہوا ہے کہ پاکستان کی مقتدر ترین شخصیت نے اس کو تسلیم کرنے کا نہ صرف وعدہ کرلیا ہے، بلکہ قرائن بتاتے ہیں کہ فیصلہ ہو چکا ہے، صرف وقت کے تعین کا مسئلہ ہے کہ کب اعلان کیا جائے۔ جبکہ امریکہ کا اصرار ہے کہ اس سال کے خاتمہ تک اعلان کر دیا جائے۔ چنانچہ آج کل کرائے کے دانشور ٹی وی ریڈیو اور اخبارات میں اس کے حق میں بڑھ چڑھ کر دلائل دے رہے ہیں اور ایک کورس کے انداز میں راگ الاپ رہے ہیں کہ اسرائیل کو تسلیم کرنے میں کوئی قباحت نہیں۔ لہٰذا آیئے اس مسئلے کا تاریخی اور علمی اعتبار سے جائزہ لیں کہ یہ مسئلہ ہے کیا؟ اس کا پس منظر کیا ہے اور ہمیں اسرائیل کو کیوں تسلیم نہیں کرنا چاہئے۔

پاکستان اور اسرائیل میں مشترک قدریں:

سب سے پہلے تو اس مسئلے کا جائزہ لیتے چلیں کہ پاکستان اور اسرائیل کا آپس میں کیا تعلق ہے۔ دراصل ان دونوں ملکوں میں کچھ باتیں بظاہر مشترک ہیں، اگرچہ باطنی طور پر یہ اشتراک حقیقی نہیں بلکہ ان میں کچھ فرق ہیں۔ وہ مشترک چیزیں کیا ہیں؟

۱) یہ دونوں ملک مذہب کے نام پر قائم ہوئے۔ پاکستان کے بارے میں کسی شک و شبہ کی گنجائش نہیں، یہ ایک مسلمہ حقیقت ہے کہ پاکستان اسلام کے نام پر بنا۔ اسرائیل بھی بظاہر یہودی مذہب کے نام پر قائم ہوا لیکن یہود مذہب چونکہ باطنی طور پر ایک نسلی مذہب ہے، اس لیے اس کے قیام کی بنیاد مذہبی نہیں بلکہ نسلی ہے۔ حال ہی میں ڈربن ساؤتھ افریقہ میں ایک عالمی کانفرنس میں یہ قرارداد سامنے آئی تھی کہ اسرائیل ایک نسل پرست ریاست ہے اور یہ نسل کی بنیاد پر فلسطینیوں پر ظلم ڈھا رہا ہے۔ وہاں سے اسرائیل اور امریکہ نے واک آؤٹ کیا اور امریکہ نے اس قرارداد کو روکنے کے لیے پورا زور لگا دیا۔ بہرحال

پوری دنیا متفق تھی کہ اسرائیل ایک نسل پرست ریاست ہے، جو دوسری نسلوں پر ظلم ڈھا رہی ہے۔

۲) دوسری قدر مشترک یہ ہے کہ دونوں ملک تقریباً ہم عصر ہیں یعنی ایک ہی وقت میں وجود میں آئے۔ دونوں میں اتفاقاً ٹھیک نو ماہ کا وقفہ ہے۔ پاکستان 14 اگست 1947ء کو بنا جبکہ اسرائیل 14 مئی 1948ء کو قائم ہوا۔ میرے خیال میں اس میں بھی ایک معنوی ربط ہے جیسا کہ حدیث مبارکہ میں ہے ”اللہ نے کوئی مرض ایسا پیدا نہیں کیا، جس کی دوا نہ پیدا کی ہو۔“ گویا اللہ نے ٹھیک نو ماہ قبل اسرائیل کے علاج کے طور پر پاکستان قائم فرمایا جس نے آگے چل کر آخری معرکہ حق و باطل میں اسرائیل کے سامنے آنا ہے۔

۳) دونوں ملک (Tips of the Iceberg) کی حیثیت رکھتے ہیں۔ اسرائیل ایک چھوٹا سا ملک ہے لیکن پورا عالم عیسائیت اور مغرب اس کی پشت پر ہے۔ اسی طرح پاکستان بھی کوئی بڑا ملک نہیں لیکن پوری امت مسلمہ میں احیائے اسلام کا جو جذبہ کارفرما ہے، اس کی ساری امیدیں پاکستان سے وابستہ ہیں۔ قیامت سے قبل یہ دونوں بڑے تودے آپس میں ٹکرانے والے ہیں جیسا کہ احادیث میں قیامت سے قبل آخری جنگ کے طور پر حق و باطل میں ایک بہت بڑے معرکہ کی خبر دی گئی ہے۔

ایک بڑا فرق:

اس اشتراک کے علاوہ ایک بہت بڑا فرق جو ان دونوں ممالک میں پایا جاتا ہے، وہ یہ ہے کہ پاکستان ایک خطے میں پہلے سے مقیم ایک قوم کی دستوری اور پرامن جدوجہد کے نتیجے میں وجود میں آیا جبکہ اسرائیل کا معاملہ بالکل برعکس ہے۔ ایک قوم جو ساڑھے اٹھارہ سو سال قبل فلسطین سے نکلی تھی، آج ظلم اور دھاندلی سے یہاں آکر دوبارہ قابض ہوگئی۔ انہیں 70ء میں یہاں سے نکالا گیا، نیز جب یہ یہاں سے بے دخل ہوئے تو حاکم نہ تھے بلکہ چار سو برس سے رومیوں کے غلام تھے۔ یہودیوں کے ایک فرقے ذی لوٹس نے حضرت عیسیٰ کے رفع سماوی کے 37 برس بعد 70ء عیسوی میں رومیوں کے خلاف بغاوت کی تو ٹائیٹس رومی نامی جرنیل نے ان پر حملہ کیا اور ایک دن میں ایک لاکھ تیس ہزار یہودیوں کو قتل کیا اور انہیں

یہاں سے نکال دیا۔ اس وقت یہ پوری دنیا میں پھیل گئے۔ اس عرصے کو یہ اپنا دورِ انتشار کہتے ہیں۔

اس عرصے کے دوران نہیں کہیں پناہ نہ ملی۔ البتہ طارق بن زیاد نے جب سپین پر حملہ کیا تو وہاں آباد یہودیوں نے طارق بن زیاد کی مدد کی تو انہیں سپین کی مسلمان حکومت میں بہت زیادہ اثر و رسوخ حاصل ہو گیا، جس کو استعمال کرتے ہوئے یہودیوں نے فرانس، اٹلی اور برطانیہ سے سپین میں مسلمانوں کی قائم کردہ یونیورسٹیوں میں حصول علم کے لیے آنے والے نوجوانوں میں اپنا اثر بڑھایا جس کے نتیجے میں عیسائیت دو حصوں میں تقسیم ہو گئی۔ ایک حصہ کیتھولک اور دوسرا پروٹسنٹ بن گیا۔ یہودیوں نے پروٹسنٹ فرقے کے ذریعے سود اور سیکولرازم کو رواج دیا۔ یوں انہوں نے سودی کاروبار کی اجازت لے کر بینکنگ سسٹم قائم کیا اور عیسائی حکومتوں کو سودی قرضے دے کر اپنے شکنجے میں جکڑ لیا۔ گویا فرنگ کی رگِ جاں پنجہ یہود میں آ گئی۔ اس دوران انہوں نے فلسطین پر قبضہ حاصل کرنے کی منصوبہ بندی شروع کر دی۔ بالآخر انہوں نے برطانیہ کے ذریعے 1971ء میں یہاں آباد ہونے کا حق حاصل کر لیا۔ پہلے انہوں نے پیسے سے مکانات اور زمینیں خریدیں جب ان کی تعداد زیادہ ہو گئی تو انہوں نے دھونس اور زبردستی سے علاقوں پر قبضہ شروع کیا اور مقامی لوگوں کو طاقت کے بل پر بے گھر کر دیا۔ یہاں تک کہ یہودی ریاست اسرائیل کے قیام کا اعلان کر دیا۔

آج امریکہ انہی پروٹسٹنٹس کا امام ہے جبکہ برطانیہ اس کا چھوٹا بھائی بنا ہوا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ عراق خلاف یہ دونوں ایک تھے جبکہ اولڈ یورپ ان کے خلاف تھا کیونکہ وہ کیتھولک ہیں۔ کیتھولک اکثریت والے ممالک جنہیں قدیم یورپ کہا جاتا ہے، یروشلم میں ایک عیسائی حکومت قائم کرنا چاہتے ہیں، جبکہ پروٹسٹنٹس وہاں یہودی حکومت قائم کر کے ہیکل سلیمانی تعمیر کرانا چاہتے ہیں۔ ان کے نزدیک حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو دوبارہ زمین پر آمد اسی وقت ہو گی جب یہ مراحل طے ہو جائیں گے۔ البتہ تمام تر اختلافات کے باوجود یہ دونوں اس بات پر متفق ہیں کہ یہاں سے مسلمانوں کو نکال باہر کیا جائے۔

جہاں تک یہودیوں کا تعلق ہے وہ فلسطین ہی کا علاقہ نہیں بلکہ مصر، شام، اردن اور

سعودی عرب کے بعض علاقوں تک گریٹر اسرائیل کے قیام کی منصوبہ بندی کر رہے ہیں۔ اس کے علاوہ وہ مسجد اقصیٰ اور قبۃ الصخرہ گرا کر ہیکل سلیمانی بھی تعمیر کرنا چاہتے ہیں۔ اگر یہودیوں نے بیت المقدس میں ''قبۃ الصخرہ'' گرا دیا تو عالم اسلام کی حکومتیں اس سیلاب میں بہہ جائیں گی۔ احادیث کی رو سے قبل از قیامت اسلام اور کفر کے درمیان جو ایک فیصلہ کن ٹکر ہونے والی ہے، میرے نزدیک یہ واقعہ اس جنگ کا پیش خیمہ ثابت ہو گا۔ اس جنگ میں یہودی اور عیسائی دنیا ایک طرف ہو گی اور عالم اسلام ایک طرف ہو گا۔ اللہ کے رسول کے فرمان کے مطابق عیسائی دنیا 80 جھنڈوں تلے جمع ہو کر مسلمانوں پر حملہ آور ہو گی اور ہر جھنڈے کے نیچے 12 ہزار فوج ہو گی۔ گویا مجموعی طور پر نو لاکھ ساٹھ ہزار فوج مشرق وسطیٰ پر حملہ کرے گی۔ اس وقت حضرت مہدی اور مسیح علیہ السلام اس یلغار کا مقابلہ کریں گے، ان دونوں شخصیات کی مدد کے لیے حدیث کے الفاظ ہیں، خراساں کے علاقے سے مسلمان پہنچیں گے۔ پرانے خراساں میں افغانستان کے علاوہ پاکستان ایران کا کچھ حصہ شامل ہے۔

علامہ اقبال اور قائداعظم کے نظریات: اب آئیے دیکھیں کہ اسرائیل کے حوالے سے ہمارے اکابرین کے کیا خیالات رہے ہیں۔ مصور و مبشر پاکستان علامہ اقبال نے اپنے ایک شعر میں اس کی وضاحت یوں کی ہے۔

ہے خاک فلسطیں پہ یہودی کا اگر حق
ہسپانیہ پر حق نہیں کیوں اہل عرب کا؟

اگر دو ہزار برس پہلے نکلی ہوئی قوم کو دوبارہ فلسطین میں لا کر آباد کیا جا سکتا ہے جو یہاں کبھی حاکم بھی نہیں رہی، بلکہ محکوم تھی تو پھر عربوں کو ہسپانیہ واپس ملنا چاہئے کیونکہ وہ کئی صدیوں تک وہاں حاکم رہے ہیں۔ اسی طرح 25 اکتوبر 1947ء کو قائداعظم نے رائٹر نیوز ایجنسی کے نمائندے کو انٹرویو دیتے ہوئے کہا کہ: ''فلسطین کے بارے میں ہمارے موقف کی وضاحت اقوام متحدہ میں پاکستانی وفد کے سربراہ محمد ظفر اللہ خان نے کر دی ہے مجھے اب بھی یہ امید ہے کہ تقسیم (فلسطین) کا منصوبہ مسترد کر دیا جائے گا ورنہ ایک خوفناک چپقلش کا شروع ہو جانا ناگزیر اور لازمی امر ہے۔ یہ چپقلش عربوں اور منصوبہ تقسیم نافذ کرنے والوں

کے درمیان نہ ہوگی بلکہ پوری اسلامی دنیا اس فیصلے کے خلاف عملی طور پر بغاوت کرے گی کیونکہ ایسے فیصلے (اسرائیل کے قیام) کی حمایت نہ تو تاریخی اعتبار سے کی جاسکتی ہے اور نہ ہی سیاسی اور اخلاقی طور پر۔ایسے حالات میں پاکستان کے پاس اس کے سوا کوئی چارہ کار نہ ہوگا کہ عربوں کی مکمل اور غیر مشروط حمایت کرے اور خواہ مخواہ کے اشتعال اور دست درازیوں کو روکنے کے لیے جو کچھ اس کے بس میں ہو، پورے جوش وخروش اور طاقت سے بروئے کار لائے۔''

علامہ اقبال اور قائداعظم کے خیالات سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ اسرائیل کو تسلیم کرنا ظلم اور ناانصافی کا ساتھ دینا ہے۔ چنانچہ اس وقت اسرائیل کو تسلیم کرنے یہ نہ کرنے کے حوالے سے جو بحث جاری ہے، اس کا تجزیہ کیا جائے تو یہ اصول پرستی اور ابن الوقتی کا مقابلہ ہے۔اصول کی بات کی جائے تو اسرائیل کو کسی قیمت پر تسلیم نہ کیا جائے۔اگر گیدڑ کی سو سالہ زندگی کو بہتر سمجھتے ہوئے ابن الوقتی کو اپنائیں تو اسرائیل کو تسلیم کرنے میں فائدے ضرور ہیں مگر دیرپا نہیں۔ دراصل یہ جنگ یہودیوں اور عربوں کی نہیں مسلمانوں اور یہودیوں کے درمیان ہے۔اگر عرب ممالک کے حکمران امریکہ کی طاقت کے آگے جھک کر اسرائیل کو تسلیم کرلیں تو یہ ہمارے لیے دلیل نہیں بن سکتی۔ ویسے بھی یہ ممکن ہی نہیں کہ اسرائیل اور فلسطینیوں کے درمیان کوئی امن کا عمل کسی صورت کامیاب ہو سکے۔ موجودہ سیز فائر کے ذریعے اسرائیل محض وقت حاصل کرنا چاہتا ہے تاکہ رفتہ رفتہ مسلمانوں کی حمیت مر جائے۔ گذشتہ ایک عشرے کے مذاکرات ہمارے سامنے ہیں۔کیمپ ڈیوڈ، اوسلو، وائی ریور اور پتہ نہیں کہاں کہاں مذاکرات ہوئے لیکن عین وقت پر اسرائیل ہمیشہ مکر جاتا ہے۔ بہرحال ہم اسرائیل کو تسلیم کریں یا نہ کریں، وہ پاکستان کو کمزور کرنے اور ایٹمی اثاثے ختم کرنے یا ان پر قبضہ کرنے کی ضرور کوشش کرے گا کیونکہ اسرائیل پاکستان کو اپنا سب سے بڑا دشمن سمجھتا ہے۔

ہم امریکہ اور اسرائیل کی خوشنودی حاصل کرنے کے لیے جو چاہیں کرلیں، پاکستان کی باری آ کر رہے گی۔ اگرچہ اس وقت امریکہ کی یہ حیثیت بن گئی ہے کہ اس کے دامن

میں پناہ لینے کے علاوہ کسی کے لیے کوئی چارہ ہی نہیں۔امریکہ کا کوئی مقابلہ کر ہی نہیں سکتا کیونکہ امریکہ نے دجال کی شکل اختیار کر رکھی ہی۔اس کی دجالیت کی تکون سیکولرازم، سود اور بے حیائی پر مشتمل ہے۔لیکن اگر ہم اللہ پر بھروسہ کر کے اس وقت دین اسلام کے تقاضوں، اخلاقی اصولوں اور غیرت وحمیت کی قدروں کی پاسداری کرتے ہوئے امریکی دباؤ کے سامنے جھکنے سے انکار کر دیں اور یہاں اللہ کا دین قائم کر دیں تو اللہ کی مدد ہمیں حاصل ہوگی اور پھر کوئی پاکستان کا کچھ نہیں بگاڑ سکے گا۔

⌘⌘⌘

امریکہ کے روشن خیال ایجنڈے کی حقیقت

اس وقت پوری دنیا اور بالخصوص پاکستان، جس میں روشن خیالی اور اعتدال پسندی جیسی اصطلاحات کا بہت غلغلہ ہے، اور ہمارے حکمران امریکہ کو بار بار یہ یقین دہانی کرانے میں مصروف ہیں کہ پاکستان آپ کے روشن خیال اور اعتدال پسند ایجنڈے پر گامزن ہے اور عنقریب ہمارا معاشرہ روشن خیالی کی کامل تصویر ہوگا۔ اس صورت حال میں ضروری ہے کہ سمجھا جائے کہ امریکی روشن خیالی ایجنڈے کی حقیقت اور اس کا ہدف کیا ہے؟ امریکہ کا یہ روشن خیال ایجنڈا مغرب میں پوری طرح حاوی ہے مگر ابھی پوری نوع انسانی پر اس کا غلبہ نہیں ہوا۔ حال ہی میں رینڈ کارپوریشن جو کہ امریکی تھنک ٹینک ہے اور اپنی سفارشات امریکی محکمہ دفاع کو بھی دیتا ہے نے حال ہی میں چند سفارشات دی ہیں جس میں مطالبہ کیا گیا کہ (1) وہ افراد جو اسلام کو مذہب نہیں دین سمجھتے ہیں وہ فنڈامینٹلسٹ ہیں اور ہمارے اوّلین دشمن ہیں۔ انہیں ہر صورت میں ختم کرنا چاہیے۔ (2) وہ روایت پسند علماء جو مساجد میں امامت اور خطابت کرتے ہیں انہیں فرقہ وارانہ اختلافات میں الجھا کر رکھنا چاہیے کیونکہ یہ کبھی بھی فنڈامنٹلسٹ حضرات سے مل کر ہمارے لیے خطرے کا مؤجب بن سکتے ہیں (3) اسلام کی جدید تعبیر کرنے والے ماڈرنسٹ علماء کو پرنٹ اور الیکٹرانک میڈیا تک بھرپور رسائی دی جائے۔ (4) سیکولرسٹ حضرات پہلے سے ہی ہمارے ہم نوا ہیں۔ لہٰذا فنڈامنٹلسٹ اور روایتی علماء کو ختم کیا جائے اور ماڈرنسٹ اور سیکولر حضرات کو سپورٹ کیا جائے۔ روشن خیال ایجنڈے کی وجہ سے سماجی نظام میں پردے اور عزت وعصمت کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا، سماجی سطح پر یہ ایجنڈا کم از کم آدھی دنیا پر مسلط ہو چکا ہے البتہ ایشیا اور افریقہ میں ابھی شرم وحیا کا کچھ عنصر باقی ہے اور خاندانی نظام بھی کسی حد تک برقرار ہے امریکہ اور مغرب کی جانب سے ایک زبردست تحریک روشن خیالی اور اعتدال پسندی کے عنوان سے چلائی جا رہی ہے۔ تا کہ یہ بھی ہم جیسے ہو جائیں اور بلکہ اس حد تک لبرل اور روشن خیال ہو

جائیں کہ بیوی زنا کر رہی ہے تو کرتی رہے یہ اسکی مرضی ہے۔ بیٹا اور بیٹی آوارہ ہیں تو مجھے کیا۔ اگرچہ مسلمان ملکوں کا ایلیٹ (Elite) طبقہ اس رنگ میں رنگا جا چکا ہے۔ یعنی بالائی طبقے کی اکثریت بے پردگی، فحاشی، عریانی اور آزاد جنس پرستی اختیار کر چکی ہے۔ روشن خیالی کے امریکی ایجنڈے میں آپ جس طرح چاہیں اپنی جنسی خواہش کو پورا کریں، بس دونوں طرف کی رضا مندی مطلوب ہے، زنا بالجبر قانون کی خلاف ورزی شمار ہوتا ہے، لیکن زنا بالرضا سرے سے کوئی جرم نہیں۔ اس روشن خیالی ایجنڈے کے نتیجے میں فیملی سسٹم برباد ہوگیا، والدین بچوں کو بلوغت کی قانونی عمر کے بعد گھر سے نکال دیتے ہیں۔ چاہے لڑکا ہو یا لڑکی، خود جا کر کماؤ اور کھاؤ۔ اگر ہم پر کچھ ذمہ داری تھی تو بس ایک خاص عمر تک تھی۔ ظاہر ہے پھر اولاد کو بھی ماں اور باپ کی کیا فکر ہوگی۔ چنانچہ یورپ اور امریکہ کے معاشروں میں بڑھاپے میں ماں باپ کو Old House میں چھوڑ دیا جاتا ہے۔ مغرب نے اپنے نظریات کے نفاذ کے لیے 1994 میں قاہرہ میں اور پھر اگلے برس بیجنگ میں بہبود آبادی کانفرنس منعقد تھی جس کا ایجنڈا روشن خیالی پر مبنی تھا یعنی عورت کی آزادی اس کے بعد جون 2000ء میں بیجنگ پلس فائیو کانفرنس ہوئی جس میں یہ مطالبہ کیا گیا کہ طوائفانہ زندگی (Prostitution) کو قابل احترام پیشہ سمجھا جائے دوسرے نمبر پر ہم جنس پرستی چاہے وہ دو عورتوں (lesbians) کے درمیان ہو اور چاہے دو مردوں (Gays) کے درمیان ہو اس کو (Normal Orietation) برا نہ سمجھا جائے پھر یہ کہ عورت اور مرد برابر ہیں ان کی ووٹنگ برابر ہوگی اور عورت کو طلاق کا بھی برابر حق حاصل ہوگا اور گھریلو ذمہ داریوں اور تولیدی خدمات پر وہ اپنے شوہر سے اجرت بھی طلب کر سکتی ہے کیونکہ وہ ایک طرح سے خاوند کی مزدور ہے۔ اگر وہ حمل کی تکلیف گوارہ کرے تو اس پر بھی وہ اجرت لے سکتی ہے۔ تو یہ ہے امریکہ کا وہ روشن خیال ایجنڈا جس کو سامنے لایا جا رہا ہے اور اس کو سوشل انجینئرنگ (Social Engineering) جیسا خوبصورت نام دیا گیا ہے، یعنی ہمیں دنیا کے سماجی نظام کی ایک نئی تعمیر کرنی ہے اور اس پروگرام کو یونائیٹڈ نیشن کی جنرل اسمبلی نے منظور کیا ہے اور اس پر دستخط کرنے والے ممالک میں اسلامی جمہوریہ پاکستان بھی شامل

ہے۔ پاکستان اس ایجنڈے پر تیزی سے عمل کرنے والا ملک ہے۔ موجودہ حکومت نے ہر سطح پر خواتین کو 33 فیصد نمائندگی دی ہے جو دنیا کی کسی بھی جمہوریت حتیٰ کہ بھارت جیسے ملک میں بھی ایسا نہیں اس طرح امریکی روشن خیالی ایجنڈے کی دوڑ میں اس وقت پاکستان سب سے آگے ہے۔ پاکستان میں اس نظام یا ایجنڈے پر عمل کے لئے یونائیٹڈ نیشنز اور امریکہ کی حکومتیں NGO's کو کروڑوں روپے کے فنڈ دیتی ہیں حال ہی میں ایک امریکی ریاست کے چرچ میں امینہ ودود نامی عورت نے مردوں اور عورتوں کی جماعت کی امامت کروائی ہے۔ جسے مغربی میڈیا نے بہت کوریج دی ہے حالانکہ اس حوالے سے مسلمانوں کے تمام مکاتب فکر کا اجماع ہے کہ عورت نہ مؤذن بن سکتی ہے اور نہ ہی مردوں کی امامت کرواسکتی ہے احادیث میں عورتوں کو صرف عورتوں کی باجماعت نماز کی اجازت چند شرائط کے ساتھ مذکور ہے۔ سوشل انجینئرنگ پروگرام کے ذریعے وہ عورتوں کو مردوں کے ساتھ مساوات کا نعرہ دے کر ہمارے خاندانی نظام میں دراڑ پیدا کرنے چاہتے ہیں۔ اور ان NGO's کے تحت ملک میں نیا نظام تعلیم بھی لایا جارہا ہے جس میں زیادہ توجہ بھی اسی بات پر مزکور ہے کہ طالبات کے اندر شعور پیدا ہو کہ والدین یا شوہر کے تابع ہو کر کیوں رہیں۔ اس ایجنڈے کا آخری مرحلہ مغرب میں تو اپنی انتہا کو پہنچ چکا ہے یعنی مرد اور عورت کو شادی کے بندھن سے آزاد کرنا اور بغیر شادی کے اولاد کا بھی ہونا یعنی حرامی بچوں کی ولادت۔ چند سال قبل امریکہ کے سابق صدر کلنٹن نے ایک اجلاس میں کہا تھا ’’کہ عنقریب ہماری قوم کی اکثریت حرام زادوں پر مشتمل ہوگی‘‘ بلکہ اُس کے الفاظ تھے Born without any wed lock یعنی بغیر شادی کے حرامی بچوں کی ولادت۔ مغرب میں پوری طرح غلبے کے بعد اب سپر پاور امریکہ پوری طاقت اور قوت کے ساتھ اس نظام کو روشن خیالی کے لیبل سے پوری دنیا پر لاگو کرنا چاہتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ صدر بش کہتے ہیں کہ ہم ایشیا کی Modernize کرنا چاہتے ہیں۔ عرب میں شریعت کے کچھ قوانین نافذ ہیں۔ ایران نے ایسا کیا ہوا ہے۔ پاکستان میں خاندانی نظام مضبوط ہے اور عوامی سطح پر نماز، روزہ کی پابندی ہے تو یہ سیکولرزم کی نفی ہوگئی۔ لہٰذا ان سب کو ختم کیا جائے۔ افغانستان

میں مذہب کی بنیاد پر ایک قانونی ڈھانچہ تشکیل دیا جارہا تھا تو اسے جڑ سے اکھاڑ دیا گیا۔ پاکستان میں صدر پرویز مشرف امریکی روشن خیال ایجنڈے کے نفاذ کے لیے کوشاں ہیں انہیں مزید مہلت ملی تو یہ کمال اتاترک سے بھی سبقت لے جائیں گے۔ ہمارے حکمرانوں کو ہوش کے ناخن لینے چاہیے اور سوچنا چاہیے کہ جو تہذیب ہم اپنے ملک میں نافذ کرنے کے لیے امریکی چمچے بنے ہوئے ہیں وہ تہذیب یورپ اور امریکہ میں اپنی موت آپ مر رہی ہے۔

⌘⌘⌘

حقیقی جہاد فی سبیل اللہ

جس طرح ہمارے تمام دینی تصورات محدود اور مسخ ہو چکے ہیں، اسی طرح جہاد کا لفظ بھی ہمارے ہاں بہت ہی محدود معنی میں استعمال ہو رہا ہے، بلکہ اکثر و بیشتر بہت غلط معنی میں استعمال ہوتا ہے۔ آیئے قرآن و حدیث کی روشنی میں جائزہ لیں کہ جہاد فی سبیل اللہ ہے کیا؟ اس لفظ کے لغوی معنی کیا ہیں؟ اس کا حقیقی مفہوم کیا ہے؟ ہمارے دین میں اس کا مقام و مرتبہ کیا ہے؟ اس جہاد کی کیا کیا شکلیں ہیں؟ اس کے مقاصد کیا ہیں؟ اس کا نقطہ آغاز کیا ہے؟ اس کی پہلی منزل کیا ہے اور اس کی آخری منزل کون سی ہے؟ اس ضمن میں ایک عظیم مغالطہ تو یہ ہوا کہ جہاد کو جنگ کے ہم معنی بنا دیا گیا، حالانکہ جہاد کے معنی ہرگز جنگ کے نہیں ہیں۔ جنگ کے لیے قرآن مجید کی اپنی اصطلاح ''قتال'' ہے جو قرآن میں بکثرت استعمال ہوئی ہے۔ یہ اصل میں جہاد کی ایک آخری صورت اور آخری منزل ہے، لیکن جہاد اور قتال کو بالکل مترادف بنا دینے کا نتیجہ یہ نکلا ہے کہ اب جہاد کی وسعت اور ہمہ گیری پیش نظر نہیں رہی۔ اس ایک مغالطے کے بعد ستم بالائے ستم اور ظلم بالائے ظلم یہ ہوا ہے کہ مسلمان کی ہر جنگ کو جہاد قرار دے دیا گیا، خواہ وہ خیر کے لیے ہو یا شر کے لیے۔ کوئی ظالم و جابر مسلم حکمران اپنی نفسانیت کے لیے، اپنی ہوس ملک گیری کے لیے کہیں خونریزی کر رہا ہو تو اس کا یہ عمل بھی جہاد قرار پایا اور اس طرح اس مقدس اصطلاح کی حرمت کو بٹہ لگایا گیا ہے۔ آیئے ذرا تفصیل کے ساتھ جائزہ لیں کہ قرآن مجید کے نزدیک جہاد کی اصل حقیقت کیا ہے۔

لفظ جہاد کا سہ حرفی مادہ ''ج ھ د'' ہے اور یہ لفظ اردو بولنے اور اردو لکھنے والوں کے لیے کسی درجہ میں بھی نامانوس نہیں ہے۔ جہد مسلسل، جدوجہد، یہ الفاظ اردو زبان میں عام استعمال ہوتے ہیں۔ جہد کے معنی ہیں کوشش کرنا۔ انگریزی میں اس کا مفہوم ان الفاظ میں ادا ہوگا۔ "To Exert Ones Utmost" کسی بھی مقصد کے لیے، کسی بھی معین ہدف

کے لیے محنت کرنا کوشش کرنا، مشقت کرنا جدوجہد کرنا اصلاً ''جہد'' ہے۔ لیکن عربی زبان میں یہی مادہ جب مختلف سانچوں میں ڈھلے گا تو اس سے لفظ ''مجاہدہ'' بنے گا جیسے لفظ ''مقاتلہ'' ہے ''قتل'' اور ''مقاتلہ'' میں فرق یہ ہے کہ قتل ایک یک طرفہ فعل ہے۔ ایک شخص نے دوسرے کو قتل کر دیا۔ جب کہ مقاتلہ یہ ہے کہ دو افراد ایک دوسرے کو قتل کرنے کے لیے آمنے سامنے آ کھڑے ہوں، وہ اسے قتل کرنے کے درپے ہو اور یہ اسے قتل کرنے کے درپے ہو۔ اسی طرح لفظ ''جہد'' میں یکطرفہ کوشش کا تصور سامنے آتا ہے، یعنی کسی ہدف اور مقصود کے لیے محنت کی جا رہی ہے، مشقت ہو رہی ہے، جب کہ مجاہدہ میں ایک اضافی تصور سامنے آئے گا کہ کوشش میں مختلف فریق شریک ہیں۔ ہر ایک کا اپنا کوئی مقصد اور اپنا کوئی نقطہ نظر ہے اور ہر ایک اس کوشش میں ہے کہ اپنے مقصد کو حاصل کرے اور اپنے خیال یا اپنے نظریئے کو دنیا میں سربلند کرنے کی کوشش کرے۔ ''جہاد فی سبیل اللہ'' درحقیقت قرآن مجید کی ایک اہم اصطلاح ہے۔ جہاد اور مجاہدہ دونوں باب مفاعلہ سے مصدر ہے۔ انگریزی میں اب اس کو یوں ادا کیا جائے گا To Struggle Hard اس لیے کہ Struggle میں کشمکش اور کشاکش کا مفہوم شامل ہے۔ جہد صرف کوشش ہے جب کہ جہاد یا مجاہدہ کشمکش اور کشاکش ہے اور انگریزی کے اس لفظ Struggle میں بھی وہ تصور موجود ہے۔ مجاہدہ خواہ کسی مقصد کے لیے ہو اس میں انسان کی صلاحیتیں، قوتیں اور توانائیاں بھی صرف ہوں گی اور مالی وسائل و ذرائع بھی صرف ہوں گے۔ ان دو کے بغیر دنیا میں کوئی کوشش ممکن نہیں ہوتی۔ ابتدائی سطح پر کسی بھی مقصد کے لیے، کسی بھی نصب العین کے لیے، کسی بھی خیال کی ترویج و اشاعت کے لیے انسان کو کچھ مالی وسائل و ذرائع کی ضرورت ہوتی ہے، جن سے وہ اپنے نصب العین اور آئیڈیا کو Project کر سکے۔ لہٰذا قرآن مجید میں بھی آپ دیکھیں گے کہ اس مجاہدے کے ساتھ دو الفاظ آپ کو ہر جگہ ملیں گے۔ ''اپنے مال اور اپنی جان کے ساتھ''۔ یعنی اس مجاہدے، اس جدوجہد اور اس کی کوشش میں اپنے مال بھی کھپاؤ اور اپنی جانیں بھی کھپاؤ جیسا کہ سورۃ الحجرات کی آیت میں ارشاد ہوا: ''اور انہوں نے جہاد کیا اللہ کی راہ میں اپنے مالوں اور اپنی جانوں کے ساتھ۔'' اس جہاد کے لیے ایک تیسری چیز جو بہت

ضروری ہے وہ کسی ہدف کا معین ہونا ہے۔کوئی مقصود معین ہو،کوئی نصب العین ہو،جس کے لیے وہ محنت اور مشقت کی جائے۔لہٰذا سورۃ الحجرات میں فرمایا گیا ’’اورانہوں نے جہاد کیا اللہ کی راہ میں کھپائی اس میں اپنی جان بھی اوراپنے اموال بھی۔‘‘ایک بندہ مؤمن کے لیے جہاد فی سبیل اللہ کا نقطہ آغاز خود اپنے نفس کے ساتھ مجاہدہ ہے۔اس لیے کہ ایمان کا حاصل تو یہی ہے کہ انسان نے اللہ کو مانا، اللہ کے رسولؐ کو مانا، اللہ کی کتاب کو مانا، آخرت کو مانا، بعث بعدالموت، حساب کتاب اور جزاوسزا کو مانا۔اگر یہ ماننا صرف زبانی اقرار کے درجے میں نہیں ہے۔ بلکہ فی الواقع ان حقائق پر انسان کا ذہن مطمئن ہو چکا ہے، دل میں یقین جاگزیں ہوگیا ہے اوراس سے اس کا باطن منور ہوگیا ہے تواس کا نتیجہ لازمی یہ ہوگا کہ اس کے اپنے اندرایک کشاکش پیدا ہوگی، ایک تصادم اس کی شخصیت کے داخلی میدانِ کارزار میں برپا ہو جائے گا۔اس کشاکش کا آغاز اسی لمحے ہو جاتا ہے جیسے ہی ایمان دل میں داخل ہوتا ہے۔ایمان کا تقاضا یہ ہے کہ خواہ تمہاری بھوک ہو یا شہوت ہو، یا کوئی اورفطری جذبہ اور تقاضا تمہارے باطن میں سے ابھر رہا ہو،اس کی تسکین اب حلال اور حرام کی قیود اور حدود کے اندر اندر کرنی ہوگی، مادر پدر آزاد ہوکر اب کوئی کام نہیں ہوگا۔یہیں سے اس کشاکش کا آغاز ہو جاتا ہے۔ چنانچہ نبی اکرم ﷺ سے پوچھا گیا ’’اے اللہ کے رسولؐ سب سے اعلیٰ اورافضل جہاد کون سا ہے؟‘‘ جواباً آپ نے ارشاد فرمایا: ’’کہ تو اپنے نفس کے ساتھ کشمکش کرے اوراسے اللہ کی اطاعت کا عادی اور خوگر بنائے۔‘‘ یہ نقطہ آغاز ہے جہاد کا جیسے کہ ایک اورمقام پر آنحضور ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ ’’تم میں سے کوئی شخص حقیقی معنی میں مؤمن نہیں ہوسکتا جب تک کہ اس کی خواہش نفس تابع نہ ہو جائے اس کے کہ جو میں لے کر آیا ہوں۔‘‘ اچھی طرح جان لینا چاہئے کہ جولوگ مجاہدہ فی سبیل اللہ کے اس باطنی میدان کارِزار میں کوئی فتح اور بالادستی حاصل کیے بغیر باہر کے دشمنوں سے لڑائی لڑنا شروع کر دیتے ہیں وہ دراصل خودفریبی کا شکار ہیں۔باہر کے دشمنوں سے نبردآزمائی اور مجاہدہ ومقاتلہ سے پہلے اپنے نفس سے کشاکش اوراسے احکامِ الٰہی کا پابند بنانے کی جدوجہد لازم اورناگزیر ہے۔اس لیے کہ جہاد ومجاہدہ کا صحیح اورفطری طریقہ یہی ہے کہ مجاہدے کا آغاز خود اپنی ذات سے ہو۔جس

طرح ایک پودا زمین میں سے نکلے، پھوٹے اور پھر پروان چڑھے تو وہ ایک مضبوط وتناور درخت بن سکتا ہے۔اسی طرح مجاہدہ مع النفس وہ جڑ ہے جو انسانی شخصیت کے باطن میں اگر گہری نہ اتر گئی ہو اور صرف اوپر ہی اوپر زمین میں اٹکی ہوئی ہو تو پھر یہ کسی بھی سیلاب اور کسی بھی نوع کے دباؤ کا مقابلہ کرنے کی صلاحیت نہیں رکھتی۔ یہ مجاہدہ مع النفس جب انسان کے باطن سے پھوٹتا ہے تو یہ اللہ کے دین کے دشمنوں سے مجاہدہ، کشاکش اور جدوجہد کی صورت اختیار کرتا ہے۔اس کی اوّلین منزل دعوت اور تبلیغ وتلقین ہے۔ یہ درحقیقت اس مجاہدہ فی سبیل اللہ کا خارج میں پہلا ہدف ہے کہ جو بات آپ نے حق مانی ہے اس کی حقانیت کا اعلان کیجئے، اس کی حقانیت کو دنیا کے سامنے پیش کیجئے۔ یہ آپ کی شرافت نفس کا تقاضہ بھی ہے۔ نبی اکرم ﷺ کی بڑی پیاری حدیث ہے کہ ’’تم میں سے کوئی شخص اس وقت تک مؤمن نہیں ہوسکتا جب تک کہ وہ اپنے بھائی کے لیے بھی وہی پسند نہ کرے جو اپنے لیے پسند کرتا ہے۔‘‘ دعوت وتبلیغ، امر بالمعروف اور نہی عن المنکر ہی کا ابتدائی مرحلہ ہے۔اس میں تلقین اور نصیحت بھی شامل ہے اور حق کی نشرواشاعت اوراس کا ابلاغ بھی۔اس ابلاغ کے لیے ظاہر بات ہے کہ ہر دور میں جو بھی ذرائع میسر ہوں وہ بھرپور طریقے پر استعمال کیے جائیں۔ نبی کریم ﷺ کی سیرت پاک میں اس کی مثالیں موجود ہیں آپؐ انفرادی ملاقاتیں بھی کرتے تھے، آپ گلیوں میں بھی تبلیغ فرماتے تھے، جہاں کہیں معلوم ہوا کہ کوئی قافلہ ٹھہرا ہوا ہے وہاں پہنچ کر اپنی دعوت پیش فرماتے تھے۔حج کے ایام میں آپؐ کی یہ دعوتی سرگرمیاں پورے عروج کو پہنچ جاتی تھی۔ملک کے کونے کونے سے لوگ آئے ہوتے تھے، آپؐ مختلف وادیوں میں گھومتے اور جہاں کہیں کسی قبیلے کا پڑاؤ دیکھتے وہاں جا کر اپنی دعوت پیش کرتے۔‘‘ یہ ہے درحقیقت جہاد فی سبیل اللہ کا اوّلین مرحلہ۔اسے تبلیغ کہئے، دعوت کہئے یا نشرو اشاعت کہیے۔اس میں محنت ومشقت ہوگی، اوقات صرف ہوں گے، صلاحیتیں کھپیں گی۔ ضرورت اس بات کی ہوگی کہ باصلاحیت لوگ آئیں اوراپنی صلاحیتوں کو اس راہ میں صرف کریں۔ نبی اکرم ﷺ پر ایمان لانے کے بعد حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ پھر اپنے کاروبار میں منہمک نہیں ہوئے، بلکہ آپ اسی کشاکش، اسی کوشش اوراسی جدوجہد میں

ہمہ تن مصروف ہو گئے، اور چند سال کی محنت کا نتیجہ یہ نکلا کہ عشرہ مبشرہ میں سے چھ اصحاب کو لا کر انہوں نے محمد رسول اللہ ﷺ کی جھولی میں ڈال دیا۔ یہ ہے اس مجاہدہ فی سبیل اللہ کی پہلی منزل! یہ بات واضح رہنی چاہیے کہ جنگ اور قتال کا مرحلہ تو نبی اکرم ﷺ کے دورِ نبوت میں کہیں پندرہ برس کے بعد آیا۔ مکہ مکرمہ کے تیرہ برسوں میں اور پھر قیام مدینہ کے ابتدائی دو برسوں میں مجاہدہ جاری رہا۔ مجاہدہ فی سبیل اللہ کا اوّلین ہدف یہ ہے کہ خلق خدا پر خدا کی طرف سے دعوت وتبلیغ کے ذریعے حجت قائم کر دی جائے تا کہ روزِ قیامت انسان یہ عذر نہ پیش کر سکے کہ اے رب! ہمیں معلوم نہ تھا کہ تیرا دین کیا ہے۔ ظاہر بات ہے کہ اس کام میں محنتیں بھی لگیں گی اور صلاحیتیں بھی صرف ہوں گی، تب ہی تو کوئی داعی حق خلق خدا پر حجت قائم کر سکے گا کہ جو حق میرے پاس تھا میں نے تمہارے سامنے رکھ دیا ہے، کسی قسم کے اخفا سے کام نہیں لیا ہے۔ قارئین جہاد فی سبیل اللہ کا آخری ہدف کیا ہے؟ ہمیں معلوم ہونا چاہیے کہ اس کائنات کا سب سے بڑا حق یہ ہے کہ اللہ کی زمین پر اسی کا حکم نافذ ہو۔ زمین بھی اللہ کی ہے اور حکم بھی اللہ کا ہونا چاہیے۔ بالفاظ قرآنی ''حکم اور فیصلے کا اختیار سوائے اللہ کے کسی کو حاصل نہیں۔'' گویا تمام حقائق میں سب سے فائق حق یہی ہے کہ اللہ کی زمین پر اس کے اختیار کو عملاً نافذ و غالب ہونا چاہیے جب کہ بالفعل معاملہ اس کے برعکس ہی۔ چنانچہ اس حق کو بالفعل دنیا میں نافذ کرنے کے لیے اب ایک مزید محنت درکار ہو گی، مزید جدوجہد کی ضرورت ہو گی۔ دعوتِ تبلیغ کے لیے محنتیں اور کوششیں اپنی جگہ اہم ہیں، مزید جدوجہد کی ضرورت ہو گی۔ لیکن یہ بات ذہن میں رکھئے کہ اگر کسی بے ضرر قسم کی بات کی تبلیغ کی جا رہی ہو، جس میں کسی پر کوئی تنقید نہ ہو اور جس میں کسی کے مفادات پر کوئی آنچ نہ آتی ہو تو کوئی تصادم نہیں ہو گا، لیکن اگر تبلیغ صحیح معنی میں کہ جس میں حقیقت ہی کو سامنے لایا جائے اور حق بات کے کہنے سے دریغ نہ کیا جائے، خواہ اس سے لوگوں کے مفادات پر آنچ آ رہی ہو، یا ان کے غلط نظریات اس سے مجروح ہو رہے ہوں، تو ظاہر بات ہے کہ تصادم اور کشمکش کا مرحلہ آ کر رہے گا۔ یہی وجہ ہے کہ یہ تصادم اور کشمکش مکی دور میں بھی ہمیں نظر آتا ہے۔ لیکن اس سے آگے مرحلہ آتا ہے جب داعی حق یہ کہتا ہے کہ ہم صرف مبلغ نہیں ہیں،

ہم صرف داعی نہیں ہیں، بلکہ ہم تو حق کو قائم اور غالب کرنے کے لیے اٹھے ہیں، ہم عدل و انصاف کا صرف وعظ کہنے کے لیے نہیں آئے، بلکہ ہم عدل و انصاف کو بالفعل نافذ کرنا چاہتے ہیں۔ تو سیدھی سی بات ہے کہ یہاں تصادم اب مزید شدت اختیار کرے گا۔ جن کے مفادات پر آنچ آئے گی وہ اسے کبھی ٹھنڈے پیٹوں برداشت نہیں کریں گے۔ وہ اپنی پوری قوتوں کو اور اپنے تمام وسائل و ذرائع کو مجتمع کر کے مزاحمت کریں گے اور اس دعوت کی راہ روکنے اور اسے کچلنے کے لیے ایڑی چوٹی کا زور لگا دیں گے۔ اس مرحلے پر یہ کشاکش اور تصادم انتہائی شدید اور ہولناک صورت اختیار کرے گی۔ یہ ہے اس مجاہدہ فی سبیل اللہ کا نقطۂ عروج، جس کا نقطۂ آغاز ہے ''مجاہدہ مع النفس۔'' نفس انسانی سے یہ مجاہدہ جب خارج کی طرف آتا ہے تو یہ تبلیغ دین، دعوت دین، امر بالمعروف و نہی عن المنکر کی صورت میں ظہور پذیر ہوتا ہے۔ اس سے اصل مقصود یہ ہے کہ خلق خدا پر خدا کی طرف سے حجت قائم کر دی جائے اور اس کی بلند ترین منزل یہ ہے کہ ''پورے کے پورے دین اور پورے نظام زندگی پر اللہ کے دین کو غالب کر دیا جائے۔'' قرآن مجید اس حقیقت کو یوں بیان کرتا ہے ''کہ اے مسلمانو! جنگ جاری رکھو، تمہاری یہ جنگ جاری رہنی چاہیے، یہاں تک کہ فتنہ بالکل فرو ہو جائے اور دین کل کا کل اللہ ہی کے لیے ہو جائے۔'' اس زمین پر اللہ کا حق ہے کہ اسی کی حکومت قائم ہو۔ لیکن اگر یہاں کسی اور نے اپنی حکمرانی کا تخت بچھایا ہوا ہے اور کسی فرعون یا نمرود کی مرضی یہاں رائج ہے تو قرآن حکیم کی اصطلاح میں فتنہ ہے جو فساد فی الارض کی بدترین شکل ہے۔ اس فتنے کو ختم کرنا اور اس بغاوت کو فرو کرنا ایک بندہ مؤمن کا مقصد حیات بن جانا چاہیے۔ ہمارے اس دور انحطاط میں جہاد فی سبیل اللہ پر دو ظلم روا رکھے گئے۔ ایک یہ کہ اس کو جنگ کے مترادف قرار دے دیا گیا۔ چنانچہ اس کی وسعت، اس کی ہمہ گیری، اس کا نقطۂ آغاز، اس کے وہ سارے مراحل جن میں دعوت وتبلیغ بھی ہے، نشر و اشاعت بھی ہے، پھر جو لوگ اس حق کو قبول کر لیں ان کو ایک نظم میں پرو کر ایک منظّم قوت کی شکل دینا اور انہیں آئندہ کے مراحل کے لیے مناسب تربیت دینا بھی شامل ہے، یہ سب ذہن سے بالکل خارج ہو گئے۔ دوسرا ظلم یہ ہوا کہ مسلمانوں کی ہر جنگ کو بہر حال اور

بہرنوع جہاد قرار دے دیا گیا۔ اس طرح ''جہاد'' کے لفظ کو ہم نے انتہائی بدنام کر دیا اور اس کے مقدس تصور کو بہت بری طرح مجروح کیا گیا اور تیسرا ظلم اس پر یہ ڈھایا گیا کہ جہاد کو فرائض دینی کی فہرست سے خارج کر دیا گیا کہ یہ فرض عین نہیں ہے، بلکہ فرض کفایہ ہے۔ یہ درحقیقت مسلمانوں کے اندر سے جذبہ جہاد کو ختم کرنے کی سازش کا حصہ ہے۔ ایمان حقیقی، جس کی بنیاد پر آخرت میں معاملے طے ہوں گے، جس کی بنیاد پر اللہ تعالیٰ کسی کو آخرت میں مؤمن قرار دے گا، اس ایمان حقیقی کے دو ارکان ہیں ایک یقین، جو قلب میں جاگزیں ہو گیا ہو اور دوسرے اس کا جو اوّلین اور نمایاں ترین مظہر انسان کے عمل میں ہو وہ جہاد ہے وہ کشاکش اور تصادم ہے، اس راہ میں جان اور مال کھپانا ہے۔ اس کا نقطہ آغاز خود اپنے نفس کو اللہ اور اس کے رسول ﷺ کے احکام کا پابند بنانے کے لیے اس کے ساتھ مجاہدہ ہے اور اس کے لیے ابتدائی مرحلہ یہ ہے کہ دعوت وتبلیغ، نشر واشاعت اور تمام ممکنہ ذرائع ابلاغ کو کام میں لا کر حق کی دعوت کو پھیلایا جائے اور اس کی آخری منزل یہ ہے کہ جس طریقے سے اس شخص نے اپنے وجود پر اللہ کے دین کو قائم اور اللہ کی مرضی کو نافذ کیا ہے اور اللہ اور اس کے رسول ﷺ کی اطاعت کو اس پر بالفعل قائم کر دیا ہے، اسی طرح پورے کرۂ ارض پر اللہ کے دین کو عملاً نافذ اور غالب کرنے کے لیے جان اور مال لگائے۔ اس کے لیے تن من دھن سے کوشش کرے جہاد کا آخری اور بلند ترین مرحلہ یہ ہے کہ انسان اپنی جان ہتھیلی پر رکھ کر میدان جنگ میں حاضر ہو جائے اور اللہ تعالیٰ توفیق دے تو مرتبہ شہادت حاصل کرے۔

شہادت ہے مطلوب و مقصود مؤمن
نہ مال غنیمت، نہ کشور کشائی!

⌘⌘⌘

رسولِؐ انقلاب کا طریق انقلاب

یہ مضمون شروع کرنے سے قبل میں اپنے قارئین سے ایک سوال کرنا چاہتا ہوں کہ ہر شخص یہ سوچے کہ آج امت مسلمہ کی سب سے بڑی ضرورت کیا ہے؟ کیا مال و دولت، حکومت، تعلیم، ٹیکنالوجی، جمہوریت ہماری سب سے بڑی ضرورت ہیں؟ اگر یہی سوال کوئی مجھ سے پوچھے تو میرے خیال میں امت مسلمہ کی سب سے بڑی ضرورت یہ ہے کہ وہ اسلامی انقلاب برپا کرنے کے اس طریقے کو سمجھ لے کہ جس طریقے پر نبی اکرمؐ نے انقلاب برپا کیا۔ اس حوالے سے میں اپنی سوچ کے جو پہلو آپ کے گوش گزار کرنا چاہتا ہوں وہ یہ کہ آج عالمی پیمانے پر امت مسلمہ جس زبوں حالی کا شکار ہے یہ اصل میں عذاب الٰہی ہے جس میں ہم مبتلا ہو چکے ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ہم زمین پر اللہ تعالیٰ کے دین کے نمائندے بنائے گئے تھے لیکن آج ہم پوری دنیا میں کوئی ایک ماڈل ملک بھی نہیں دکھا سکتے کہ لوگو! آؤ دیکھو یہ ہے نظام مصطفی ﷺ، یہ ہیں دین حق کی برکات، لہٰذا ہم اللہ کے عذاب کی گرفت میں ہیں۔ اگر ہم ملک میں صحیح اسلامی نظام نافذ کر لیں تو امریکہ سمیت دنیا کی کوئی طاقت ہمارا کچھ نہیں بگاڑ سکتی۔ اگر پاکستان میں اسلامی انقلاب نہ آیا تو خدانخواستہ اس کے قائم رہنے کی وجہ جواز ختم ہو جائے گی کیونکہ یہ تو قائم ہی اسلام کے اصول حریت واخوت و مساوات کا عملی نمونہ دنیا کے سامنے پیش کرنے کے لیے کیا گیا تھا۔ یہ اس لیے بھی ضروری ہے کہ آج امریکہ اور اس کے تمام اتحادی اس بات پر تلے ہوئے ہیں کہ اسلامی نظام کا کہیں ظہور نہ ہو جائے۔ بقول علامہ اقبال ''عصر حاضر کے تقاضاؤں سے ہے لیکن یہ خوف۔ ہو نہ جائے آشکارا شرع پیغمبر کہیں۔'' آج امریکہ پر یہ خوف طاری ہے کہ دنیا کے کسی کونے میں شرع پیغمبری کا عملی ظہور نہ ہو جائے۔ وہ جانتے ہیں کہ امت مسلمہ میں اسلامی نظام کے قیام کے لیے ایک جذبہ انگڑائیاں لے رہا ہے کمی صرف یہ ہے کہ اس جذبے کو صحیح راہِ عمل نہیں مل رہی۔ محض جذبہ ہی کافی نہیں اس کے ساتھ لائحہ عمل بھی ہونا چاہئے۔ اس لیے میں

عرض کر رہا ہوں کہ اسلام کو نظام زندگی کے طور پر نافذ غالب کرنے کے لیے صحیح لائحہ عمل واضح کرنے کی اشد ضرورت ہے۔ صحیح لائحہ عمل وہی ہوگا جو سیرت النبی ﷺ سے ماخوذ ہو۔ ہم نے وہ احادیث ایک جگہ جمع کر کے بہت عام کی ہیں کہ جس سے یہ یقین پیدا ہوتا ہے کہ قیامت سے قبل پوری دنیا میں اسلام کا بول بالا ہوگا اور کفار کا ''نیوز ورلڈ آرڈر'' نہیں ''اسلامک ورلڈ آرڈر'' پوری دنیا میں غالب ہوکر رہے گا۔ ظاہری بات ہے کہ یہ نظام سب سے پہلے کسی ایک ملک میں قائم ہوگا۔ ''بقول امام مالکؒ اس امت کے آخری حصے کی اصلاح نہیں ہوسکتی مگر اس طریقے پر کہ جس پر پہلے حصے کی اصلاح ہوئی تھی'' یعنی نبی کریم ﷺ نے جس طریقے سے انقلاب برپا کیا تھا اس پر عمل پیرا ہوکر انقلاب آ سکتا ہے کیونکہ وہی ہمارے لیے بہترین اسوۂ حسنہ ہیں۔ آیئے دیکھتے ہیں کہ انقلاب کہتے کسے ہیں؟ اس کے لفظی معنی ہیں تبدیلی۔ آج کل ہم اسے ہرجگہ پر استعمال کر لیتے ہیں۔ علمی انقلاب، ثقافتی انقلاب، سائنسی انقلاب، فوجی انقلاب جو کہ غلط ہے۔ کسی معاشرے کے سیاسی نظام، سماجی نظام یا معاشی نظام میں سے کسی ایک میں بنیادی تبدیلی کو صحیح انقلاب سے تعبیر کیا جا سکتا ہے۔ نبی کریم ﷺ نے مندرجہ بالا تینوں گوشوں میں تبدیلیاں لا کر تاریخ انسانی کا عظیم ترین انقلاب برپا کیا۔ کیونکہ دنیا میں جتنے بھی انقلاب آئے اس کا آئیڈیا دینے والے کوئی اور لوگ تھے اور اس کو عملی جامہ پہنانے والے دوسرے لوگ۔ انقلاب محمدی ﷺ وہ واحد انقلاب ہے جس کے تمام مراحل نبی کریم ﷺ کی حیات دنیوی میں مکمل ہوئے۔ ایک وقت میں نبی کریم ﷺ مکہ میں (Street Preaching) کر رہے ہیں اور وہی محمد ﷺ میدان بدر میں فوج کی کمان کر رہے ہیں یعنی انقلابی دعوت کا آغاز بھی آپؐ فرما رہے ہیں اور اسے آخری منزل پر بھی آپؐ پہنچا رہے ہیں۔ کل 23 سال میں اوّل سے آخر تک مراحل انقلاب مکمل فرمائے۔ آج کے دور جدید میں اجتماعیات، سوشیالوجی یا پولیٹکل سائنس کا کوئی طالب علم پوری دیانت داری سے اسلامی انقلاب کا صحیح طریقہ اخذ کرنا چاہے تو اسے مارکس، لینن یا والٹیئر سے نہیں نبی کریم ﷺ کی سیرت پاک سے مکمل راہنمائی مل سکتی ہے۔ میں اسلامی اصطلاحات دین، اسلام، ایمان، جہاد وقتال استعمال کیے

بغیر انقلاب کے مراحل آپ کے گوش گزار کرنا چاہتا ہوں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ہمارے دور زوال کے دوران ان اصطلاحات کا مفہوم محدود اور مسخ (Limited and perverted) ہو گیا ہے۔ ہم جب بھی کوئی اصطلاح استعمال کرتے ہیں وہی (Perverted) تصور ہمارے ذہنوں میں اجاگر ہو جاتا ہے لہٰذا اگر ان اصطلاحات کو ہٹا کر جدید (Terminology) میں بات کریں تو انقلاب کا خاکہ نسبتاً آسانی سے سمجھ میں آ جائے گا پھر اس خاکے میں سیرت النبی ﷺ اور قرآن وحدیث کی اصطلاحات اور واقعات کا رنگ بھریں گے۔ ایک مکمل انقلاب کے چھ یا سات مراحل حسب ذیل ہیں۔ (۱) ہر انقلاب کی پہلی ضرورت انقلابی نظریہ اور انقلابی فلسفہ ہوتی ہے۔ انقلابی نظریہ اور فلسفہ اسے کہتے ہیں جو موجودہ (Politico, Socio, Economic system) کی جڑوں پر تیشہ بن کر گرے۔ اگر فی الواقعہ ایسا ہے تو پھر وہ انقلابی نظریہ ہے ورنہ محض وعظ و نصیحت ہے۔ نظریہ نیا ہو تو معاملہ آسان ہوگا کیونکہ وہ اپنی اصطلاحات خود وضع کرے گا۔ اگر وہ نظریہ پرانا ہے تو اس کی وضاحت جدید اصطلاحات کے مطابق کرنا پڑے گی۔ پھر اس نظریے کو پھیلایا جائے اور عام کیا جائے۔ اس کے لیے دور جدید کے تمام ذرائع مثلاً پرنٹ میڈیا، الیکٹرانک میڈیا استعمال کیے جائیں۔ دوسرے مرحلے کے طور پر جو لوگ اس نظریے کو حقیقتاً قبول کریں انہیں (Listen & obey) کے اصول کے تحت منظّم کیا جائے اور تحریک میں کارکنوں کی حیثیت اور مرتبے کا تعین تحریک کے ساتھ وفاداری اور قربانی کی بنیاد پر کیا جائے۔ تیسرا مرحلہ تربیت کا ہے جس میں انقلابی جماعت کے کارکنوں کے ذہنوں سے انقلابی نظریہ ایک لمحے کے لیے بھی اوجھل نہیں ہونا چاہیے۔ اگر نظریہ ذہنوں میں راسخ ہے تو عمل کا جذبہ بھی رہے گا۔ اگر وہ مدہم پڑ گیا تو کام آگے نہیں بڑھے گا۔ اس کے لیے خاص تربیت کی ضرورت ہوگی تاکہ کارکنوں میں تحریک کے لیے تن من دھن قربان کرنے کا جذبہ بیدار رہے۔ بقول شاعر

تو بچا بچا کے نہ رکھ اسے تیرا آئینہ ہے وہ آئینہ
جو شکستہ ہو تو عزیز تر ہے نگاہ آئینہ ساز میں

اگر مجوزہ انقلابی پروگرام میں روحانیت کا کوئی پہلو موجود ہو تو کارکنوں کی روحانی تربیت بھی درکار ہوگی۔ انقلاب کے لیے چوتھا مرحلہ کہنے کو تو نمبر 4 ہے لیکن حقیقت میں اس کا آغاز پہلے مرحلے کے ساتھ ہو جاتا ہے وہ ہے صبر محض (Passive resistance) جس کا مطلب ہے کارکن اپنے موقف پر ڈٹے رہیں کھڑے رہیں لیکن کسی قسم کی جوابی کارروائی نہ کریں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ معاشرے میں انقلابی جماعت کے کارکن تالاب میں پتھر مارنے کی مانند ایک (Conflict) پیدا کرتے ہیں۔ جس کے جواب میں داعی انقلاب کی شخصیت کو مجروح کرنے اور اس کی ہمت توڑنے کی کوشش کی جاتی ہے۔ مخالفین اسے پاگل، دیوانہ اور شاعر کہیں گے اس موقع پر داعی انقلاب اگر تمام الزامات سننے کے بعد بھی اپنے موقف پر قائم اور کھڑا رہے تو پھر انقلابی جماعت کے کارکنوں کو جسمانی تشدد کا نشانہ بنایا جاتا ہے۔ انہیں مارا جاتا ہے۔ بھوکا رکھا جاتا ہے۔ جیلوں میں ٹھونسا جاتا ہے اور فائرنگ سکواڈ کے ذریعے ان کے سینے گولیوں سے چھلنی کیے جاتے ہیں۔ اس موقع پر کارکنوں کی طرف سے صبر محض کی اشد ضرورت ہوگی کیونکہ اس مرحلے میں کارکنوں کی تعداد کم ہوتی ہے اور اگر وہ مشتعل ہو جائیں تو مخالف قوت انہیں کچل دے گی اگر انقلابیوں کی طرف سے کوئی جوابی کارروائی نہ ہو اور وہ مہلت عمل حاصل کرتے ہوئے اپنے مشن پر گامزن رہیں اور اپنی Base بڑھاتے رہیں۔ اپنے تحفظ کے لیے بھی ہاتھ نہ اٹھائیں تو باطل نظام کی طرف سے جسمانی تشدد بھی ایک حد تک ہوگا وہ سب کو ختم نہیں کریں گے۔ اس کا نہایت اہم نتیجہ یہ نکلے گا کہ عوام الناس کی ہمدردیاں انقلابیوں کو حاصل ہو جائیں گی۔ گویا ''جو دلوں کو فتح کرے وہی فاتح زمانہ''۔ پانچواں مرحلہ اقدام کا ہوگا جس میں مزاحمت ہوگی۔ یہ قیادت کی ذہانت کا ثبوت ہوگا کیونکہ یہ انتہائی نازک فیصلے کا وقت ہوگا۔ اس مرحلے پر جلد بازی سے کام نہیں لینا چاہیے اور تیاری پوری ہونے کے باوجود تاخیر بھی نہیں ہونی چاہیے ورنہ موقع ہاتھ سے نکل جائے گا۔ گویا موقع گنوا دیا تو ناکامی اور اگر قبل از وقت اقدام کر دیا تو بھی ناکامی۔ اگر تعداد کافی ہو، ڈسپلن ہو اور تحریک کے لیے تن من دھن قربان کرنے کا جذبہ موجود ہو تو تحریک Passive Resistance

سے Active Resistance میں منتقل ہو سکتی ہے۔ جس میں موجودہ نظام کی کسی دکھتی رگ کو چھیڑا جائے گا اور عدم تشدد کی بنیاد پر سول نافرمانی کی تحریک چلائی جائے گی۔ اس کے بعد چھٹا اور آخری مرحلہ براہِ راست تصادم کا ہوگا۔ جس میں موجودہ نظام اور اس کے محافظوں کے ساتھ باقاعدہ جنگ ہوگی۔ کیونکہ انقلابیوں نے Active Resistance کے ذریعے نظام کو چیلنج کر دیا ہے لہٰذا باطل نظام مقابلے کے لیے آ جائے گا۔ اس موقع پر اگر انقلابیوں کی تیاری ٹھیک ہوگی، تنظیم و تربیت ٹھیک کی گئی ہوگی صحیح وقت پر اس مرحلے کا فیصلہ کیا گیا ہوگا تو انقلابی کامیاب ہو جائیں گے ورنہ ناکامی کا منہ دیکھنا پڑے گا۔ انقلاب کا ساتواں مرحلہ بھی ہے کیونکہ انقلاب کبھی بھی اپنی جغرافیائی قومی یا ملکی حدود میں نہیں رہتا کیونکہ انقلاب نام ہے انقلابی نظریہ کا جسے کسی پاسپورٹ اور ویزے کی ضرورت نہیں ہوتی۔ سچا انقلاب لازماً Export ہوتا ہے۔ قارئین کرام یہ انقلابی عمل کا وہ خاکہ ہے جسے میں نے سیرت محمد ﷺ سے اخذ کیا ہے۔ اب ہم اس میں نبی کریم ﷺ کے عظیم انقلاب کا رنگ بھرتے ہیں۔ محمد ﷺ کا انقلابی نظریہ کیا ہے ایک لفظ میں بیان کریں تو وہ ہے توحید جس کا مفہوم یہ ہے کہ روئے ارضی پر کوئی انسان یا قوم حاکم نہیں آقا اور مولا صرف خدا کی ذات باری تعالیٰ ہے۔ اس سے بڑا کوئی سیاسی نعرہ نہ تھا جو اس وقت کے سیاسی نظام کی جڑوں پر تیشہ بن کر گرتا۔ زمین اور آسمان میں ہر چیز کا مالک خدا ہے۔ انسان زمین پر اس کا خلیفہ ہے۔ انسان کے پاس جو کچھ ہے وہ اللہ کی امانت ہے۔ تمام انسان مساوی ہیں۔ اگر کوئی فرق ہے تو وہ علم و تقویٰ کی بنیاد پر ہے۔ گویا اسلام کامل انسانی مساوات کا داعی ہے۔

نبی کریم ﷺ نے اس نظریے کی تبلیغ اور اشاعت انفرادی طور پر مکہ کی گلیوں، حج کے اجتماعات اور آس پاس کے میلوں تک میں کی گویا جو طریقہ بھی ممکن تھا وہ اختیار فرمایا۔ اگلے مرحلے میں جو لوگ ایمان لے آئے ان کی تربیت کی جس کے لیے بیعت کا سلسلہ شروع کیا جس کا ثبوت ہمیں متفق علیہ حدیث میں ملتا ہے جس کے راوی حضرت عبادۃ ابن صامت ہیں۔ ''میں بیعت کرتا ہوں کہ آپ کا ہر حکم سنوں گا اور مانوں گا، خواہ تنگی ہو خواہ آسانی، خواہ

میری طبیعت آمادہ ہو خواہ مجھے اس پر جبر کرنا پڑے اور خواہ دوسروں کو مجھ پر ترجیح دی جائے اور یہ کہ نظم کے ذمہ دار لوگوں سے ہرگز نہیں جھگڑوں گا اور یہ کہ ہر حال میں حق بات ضرور کہوں گا اور اللہ کے دین کے معاملے میں کسی کی ملامت کی پرواہ نہیں کروں گا۔'' جماعت کی بنیاد رکھنے کے لیے نبی کریم ﷺ کی بیعت کی ضرورت ہرگز نہیں تھی کیونکہ آپؐ پر تو صحابہ ایمان لائے تھے یہ محض ہماری رہنمائی کے لیے تھا۔ صبر محض کے مرحلے میں نبی کریم ﷺ کی ذات ہمارے لیے کامل نمونہ ہے۔ قریش نے کئی سال تک آپؐ کی کردار کشی کی اور جسمانی تشدد کا نشانہ بنایا یہاں تک کہ آپؐ کے جسم مبارک سے خون کا فوارہ پھوٹا۔ صحابہ کرام کو بدترین تشدد کا نشانہ بنایا گیا۔ حضرت بلالؓ اور آل یاسرؓ پر ہونے والے مظالم کی داستانیں پڑھ کر رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں۔ سمع و طاعت کے تمام تقاضے پورے کئے گئے۔ دیکھئے جب ایک شخص کو معلوم ہو جائے کہ مجھے مار دیا جائے گا تو وہ مشتعل ہو کر دو چار کو مار کر مرے گا لیکن یہاں حکم ہاتھ اٹھانے کا نہیں تھا۔ حضرت خبابؓ بن ارت سے جب یہ کہا گیا کہ دہکتے ہوئے انگاروں پر لیٹ جاؤ آپؓ لیٹ گئے پیٹھ کی کھال جلی، چربی پگھلی تو اس سے وہ انگارے ٹھنڈے ہوئے۔ میرے نزدیک سمع و طاعت کا اس سے بڑا مظہر ممکن نہیں۔ اگلے مرحلہ میں تن من دھن قربان کرنے کی عالی شان مثالیں صحابہ کرامؓ نے پیش کیں۔ ویسے تو دنیوی انقلابات میں بھی لوگوں نے قربانیاں دیں اور جانیں قربان کیں لیکن مسلمان کے لیے معاملہ اتنا آسان ہے کیونکہ اس کا ایمان تو آخرت پر ہے اور اصل زندگی تو آخرت کی ہے لہٰذا وہ سب کچھ بھی خرچ کر دے تو اس کے لیے گھاٹے کا سودا نہیں۔ اسے تو کوئی سو گنا واپسی کا یقین ہے۔ مسلمان کا آخرت پر جتنا یقین مستحکم ہو گا وہ اتنا ہی دین کے لیے اپنا تن من دھن قربان کرنے کے لیے تیار ہو گا۔ یہ عقیدۂ آخرت ہی ہے جو اس وقت دنیا کو سمجھ نہیں آ رہا کہ مسلمانوں کو کیا ہو گیا ہے جانیں دینے کے لیے اس طرح آمادہ ہیں۔ کشمیر، فلسطین، چیچنیا کی مثالیں ہمارے سامنے ہیں۔ یہ عقیدہ آخرت پر یقین کی علامتیں ہیں۔

نبی کریم ﷺ کے انقلاب میں روحانی تربیت دو مرحلوں میں مکمل کی گئی۔ روحانیت پیدا کرنے کے سب سے بڑے ذریعے قرآن پاک کو دلوں میں اتارا گیا اور نفس کے تقاضوں

کی مخالفت کروائی گئی اور پھر تزکیہ نفس کے لیے اللہ کی راہ میں مال خرچ کرنے کا حکم دیا گیا ہے۔ اگلہ مرحلہ (Active Resistance) کا ہے۔ نبی کریم ﷺ کے معاملے میں اس مرحلہ میں داخل ہونے کا فیصلہ اللہ کی طرف سے تھا لہٰذا غلطی کا کوئی امکان ہی نہیں تھا لیکن آئندہ کوئی بھی تحریک اس مرحلے پر خود فیصلہ کرے گی اور غلطی کا امکان موجود رہے گا۔ نیک نیتی کے ساتھ غلطی کی صورت میں دنیا میں ناکامی کے باوجود آخرت کی کامیابی یقینی ہے۔

نبی کریم ﷺ نے ہجرت مدینہ کے بعد 6 ماہ میں تین کام کر کے اپنی پوزیشن کو مستحکم کیا۔ مسجد نبوی تعمیر فرمائی جو عبادت گاہ بھی تھی، درسگاہ بھی تھی۔ پارلیمنٹ کا کام بھی وہیں ہوتا تھا گویا ایک مرکز بن گیا۔ مہاجرین اور انصار میں مؤاخات کے اصول پر مفاہمت کروائی۔ چشم فلک نے کیسی کیسی مثالیں دیکھیں۔ انصاری بھائیوں نے ہجرت کر کے آنے والے مہاجر بھائیوں کو دکان و مکان میں برابر کا شریک کیا یہاں تک کہ جس کی دو بیویاں تھیں وہ اپنے مہاجر بھائی کو اپنے گھر لے کر گیا اور کہا کہ آپ جسے پسند کرتے ہیں میں اسے طلاق دیتا ہوں۔ آپ اس سے شادی کر لیں (یاد رہے کہ اس وقت تک پردے کے احکامات نہیں آئے تھے) میں برداشت نہیں کر سکتا کہ حضورؐ نے تمہیں میرا بھائی قرار دیا۔ تمہارا گھر آباد نہ ہو اور میرے گھر میں دو دو بیویاں ہوں۔ یہ مؤاخات تھی۔ مدینہ کے قبائل کے ساتھ میثاق مدینہ کے نام سے مشترکہ دفاع کے معاہدے کئے اب آپ نے Active Resistance کے طور پر غزوۂ بدر سے پہلے چھاپہ مار قسم کے 8 دستے بھیجے جس میں سے 4 میں خود بھی شرکت فرمائی اور اس طرح کفار کی Economic life line کو ڈسٹرب کر دیا۔ جس کی وجہ سے نبی کریم ﷺ کا سیاسی اثر و رسوخ بڑھا اور قریش کا کم ہوا اور پھر غزوۂ بدر کے نام سے حق و باطل کے معرکوں کا آغاز ہوا جو 17 رمضان المبارک 2ھ سے شروع ہو کر 10 رمضان المبارک 8 ہجری کو فتح مکہ پر ختم ہوا جس میں سینکڑوں صحابہ کو جانوں کی قربانی دینا پڑی۔ 70 صحابہ کرام تو غزوۂ احد میں شہید ہوئے جس میں حضرت حمزہؓ بھی شامل تھے۔ بالآخر 6 سال کی زبردست کشمکش اور مسلح تصادم کے بعد تاریخ انسانی کے عظیم ترین انقلاب کی تکمیل ہوئی۔ یہاں مجھے دو باتوں کی مزید وضاحت کرنا ہے۔ نبی کریمؐ نے فتح مکہ سے قبل

کوئی پیغام، خط یا مبلغ عرب سے باہر نہیں بھیجا بلکہ دس سال تک سارا کام مکہ میں ہی کیا۔ اس کے بعد طائف کا سفر فرمایا۔ یہ انقلابی عمل کی خاص بات ہے کہ یہ ابتداء میں پھیلتا نہیں ہے۔ مشنری اور تبلیغی کام پھیلتا ہے جبکہ انقلابی عمل ایک ہی مقام پر اٹھتا ہے جیسے آم کی گٹھلی سے وہ دو پتے نکلتے ہیں۔ آم کا پودا بنتا ہے، درخت بن کر برگ و بار لاتا ہے۔ وہ خربوزے اور ککڑی کی بیل کی طرح زمین پر نہیں پھیلتا لہٰذا ظاہر ہوا کہ محمد ﷺ کی جدوجہد مشنری نہیں بلکہ انقلابی تھی۔ صلح حدیبیہ کے بعد آپؐ نے کسریٰ، ہرقل، نجاشی، یمامہ اور بحرین کی طرف نامہ بر بجھوائے۔ اس موقع پر آپؐ کے ایک سفیر کو شہید کر دیا گیا تو پھر آپؐ نے جنگ موتہ اور جنگ تبوک کا معاملہ شروع کیا گویا کہ نبی کریمؐ کی حیات دنیوی ہی میں نہ صرف یہ کہ یہ عظیم انقلاب مکمل ہوا بلکہ عرب سے باہر کام کا آغاز آپؐ نے اپنے دست مبارک سے کیا اور پھر یہ ذمہ داری امت کے سپرد کی۔ دوسری بات یہ کہ اب وقت کے دریا میں بہت سا پانی بہہ گیا ہے اور حالات میں بہت تبدیلی آ چکی ہے لہٰذا اس وقت ایک بڑا سوال پیدا ہوتا ہے کہ آج کے دور میں نبی کریمؐ کے طریقہ انقلاب پر جوں کا توں عمل کیا جائے گا یا اس کے لیے کسی اجتہاد کی ضرورت ہے۔ میرے خیال میں اوپر بیان کئے گئے پہلے پانچ مراحل میں قطعاً کسی تبدیلی کی ضرورت نہیں ہے۔ آخری مرحلہ کے حوالے سے اجتہاد کی ضرورت ہے اس کی وجہ یہ ہے کہ نبی کریمؐ کے دور میں ایک طرف کفار تھے اور دوسری طرف مسلمان لیکن اس وقت دونوں طرف مسلمان ہیں۔ دوسرا یہ کہ اس وقت دونوں فریقوں میں صرف تعداد کے اعتبار سے فرق تھا۔ ادھر 313 جانثار تھے تو ادھر 1000 تھے۔ تعداد کا فرق تھا نوعیت کے اعتبار سے کوئی فرق نہ تھا اور تیسری بات یہ کہ (Social evolution) کے نتیجے میں آج اس بات کا امکان موجود ہے کہ بغیر جنگ کے حکومت تبدیل ہو سکتی ہے تو پھر اب دو صورتیں ممکن ہیں۔ ایک الیکشن دوسرا احتجاج۔ الیکشن کے نتیجے میں نظام نہیں بدلا کرتا صرف اس نظام کو چلانے والے ہاتھ بدل جاتے ہیں۔ الیکشن چاہے کتنا ہی منصفانہ ہو نظام نہیں بدل سکتا۔ آپ کے ملک میں جاگیرداری نظام چل رہا ہے تو الیکشن کے نتیجے میں کوئی جاگیرداری ہی آئے گا۔ یہ لوگ حکومت اور اقتدار میں آ کر کبھی اس نظام کو نہیں بدلیں گے۔

اب ایک راستہ باقی ہے وہ یہ کہ پرامن منظّم عوامی تحریک جو توڑ پھوڑ نہ کرے، کسی سرکاری یا غیر سرکاری املاک کو نقصان نہ پہنچائے۔ خود جانیں قربان کرنے کے لیے تیار ہوں۔ اس کو میں یکطرفہ جنگ کہا کرتا ہوں۔ یہ جنگ ہی ہے کہ ہم نے منکرات کو ختم کرنے کے لیے آپ سے بہت درخواستیں کیں لیکن اب ہمارے جیتے جی یہ نہیں ہو سکے گا۔ یہ بینک ہم نہیں چلنے دیں گے۔ گھیراؤ کریں گے اور سسٹم کو بلاک کر دیں گئے۔ چلاؤ ہم پر گولیاں۔ میرے خیال میں اس وقت یہی قابل عمل طریقہ ہے۔ اگر ہم مشتعل ہو کر اسلحہ اٹھائیں تو کس کے خلاف اٹھائیں گے۔ فوج، ائیرفورس یا نیوی کے خلاف لہٰذا اب دوطرفہ جنگ ممکن ہی نہیں ہے وہ بھی مسلح اور تربیت یافتہ افواج کے ساتھ۔ یاد رکھئے کہ اس موقع پر جنگ حرام نہیں ہے بلکہ امام ابوحنیفہؒ کے مطابق کلمہ گو حکمران کے خلاف بھی لڑ سکتے ہیں۔ جنگ جائز ضرور ہے لیکن اس وقت موزوں (Feasible) نہیں ہے۔ لہٰذا میرے خیال میں آخری مرحلے پر پرامن اور منظّم عوامی تحریک سے ہی ملک میں اسلامی انقلاب برپا کیا جا سکتا ہے۔ ورنہ ہر شخص کا خلوص و اخلاص اپنی جگہ، کامیابی ممکن نہیں۔

⌘⌘⌘

پاکستان کی قومی سیاست میں مذہبی جماعتوں کا کردار

پاکستان کی قومی سیاست میں مذہبی جماعتوں کے کردار کے مثبت منفی پہلوؤں اور اس کے میزانیہ نفع ونقصان کے موضوع پر گفتگو سے قبل تین باتوں کی وضاحت ضروری ہے۔ان میں سے دو باتیں تو سادہ بھی ہیں اور مختصر بھی، یعنی ایک یہ کہ یہاں سیاست کا وسیع تر مفہوم پیش نظر نہیں ہے بلکہ اس سے مراد صرف انتخابی سیاست ہے جس میں حصہ لینے والی جماعتیں الیکشن لڑ کر اس کے نتیجے میں حزب اقتدار یا حزب اختلاف کا کردار ادا کرتی ہیں اور دوسری یہ کہ اس گفتگو میں مذہبی جماعتوں سے مراد بھی صرف وہ مذہبی جماعتیں ہیں جو الیکشن میں براہ راست حصہ لیتی ہیں، دوسری مذہبی جماعتیں، خواہ ان کی سرگرمیاں کتنی ہی وسیع ہوں (جیسے مثلاً تبلیغی جماعت) اور وہ انتخابات پر بھی بالواسطہ اثر انداز ہوتی ہوں، اس گفتگو کے دائرے سے خارج ہیں۔تیسری وضاحت جو کسی قدر تلخ بھی ہے اور تفصیل طلب بھی، یہ ہے کہ حقیقت واقعی کے اعتبار سے قومی سیاست کا وجود پاکستان کے ابتدائی چند سالوں کے بعد ہی ناپید ہو گیا تھا۔اس کے بعد کی سیاست کو ملکی سیاست تو قرار دیا جا سکتا ہے، قومی نہیں! چنانچہ واقعہ یہ ہے کہ اس عاجز کے سامنے جیسے ہی یہ موضوع آیا اور اس نے اس پر اظہارِ خیال کے لیے غور شروع کیا، تو فوری طور پر ذہن اس روایتی لطیفے کی جانب منتقل ہو گیا کہ جب ایک ضعیف بصارت کے مریض کو ڈاکٹر نے کرسی پر بٹھا کر سامنے کی دیوار پر آویزاں چارٹ پر درج عبارت پڑھنے کو کہا تو مریض نے پوچھا ''کون سا چارٹ؟'' اور اس پر جب ڈاکٹر نے کہا ''وہ جو سامنے کی دیوار پر لگا ہوا ہے!'' تو مریض نے سوال کیا ''وہ دیوار کہاں ہے؟''......حقیقت یہ ہے کہ بالکل یہی معاملہ پاکستان کی قومی سیاست کا ہے کہ ع ''ہر چند کہیں کہ ہے نہیں ہے!'' اس میں ہرگز کوئی شک نہیں کہ مسلم لیگ نے 1937ء سے 1947ء تک کے عرصے کے دوران مسلمانانِ ہند کی عظیم قومی تحریک کی حیثیت اختیار کر لی تھی اور پورے برعظیم پاک و ہند کے مسلمانوں کا اس کے جھنڈے تلے جمع ہو جانا اتنا ظاہر

و باہر اور اس قدر حتمی اور قطعی تھا کہ وقت کی برطانوی حکومت، انڈین نیشنل کانگریس ایسی عظیم سیاسی قوت اور جمعیت علمائے ہند ایسی بااثر مذہبی جماعتوں کی مخالفت کے علی الرغم پاکستان وجود میں آ گیا......لیکن اس کے ساتھ ساتھ اس امر میں بھی ہرگز کسی شک وشبہ کی گنجائش نہیں ہے کہ اس عظیم قومی جدوجہد کے دوران بھی مسلم لیگ اصلاً صرف ایک ''تحریک'' کی حیثیت رکھتی تھی اور اسے ایسی منظم جماعت کی حیثیت حاصل نہیں تھی جس کے رہنماؤں اور کارکنوں کی صفیں اور درجے مرتب اور معین ہوں۔یہی وجہ ہے کہ جیسے ہی پاکستان قائم ہوا مسلم لیگ پر اضمحلال طاری ہو گیا۔اس ابتدائی اضمحلال کی تلافی کے لیے یہ مصنوعی صورت اختیار کی گئی کہ مسلم لیگ کی صدارت اور ملک کی وزارت عظمیٰ کو ایک ہی شخص میں جمع کر کے قومی جماعت کو حکومت کا سہارا دیا جائے۔لیکن ع ''مرض بڑھتا گیا جوں جوں دوا کی''، یعنی اس کے بھی برعکس نتائج برآمد ہوئے اور اس طرح مسلم لیگ کی عوامی جڑیں کمزور پڑتی چلی گئیں، یہاں تک کہ جلد ہی وہ صرف سرکار دربار کی زیبائش وآرائش کا ذریعہ بن کر رہ گئی۔ادھر مسلمہ قومی قیادت کے منظر عام سے ہٹنے اور قومی جماعت کے کمزور پڑنے کا نتیجہ یہ نکلا کہ پاکستان کی ملکی سیاست صرف وڈیروں، جاگیرداروں، نوابوں اور قبائلی سرداروں کے ذاتی مفادات کا کھیل بن کر رہ گئی اور اس سے میدان سیاست میں جو دھما چوکڑی مچی اسے جواز بنا کر 1958ء میں پاکستان کی بری افواج کے کمانڈر انچیف نے حکومت کی باگ دوڑ سنبھال لی۔وہ دن اور آج کا دن، پاکستان میں اقتدار کے دو مستقل ستونوں کی حیثیت فوج اور سول بیوروکریسی کو حاصل ہے۔رہے نام نہاد سیاستدان جن کی غالب اکثریت وڈیروں اور جاگیرداروں پر مشتمل ہے تو وہ اس اقلیم سیاست کے دوسرے درجہ کے شہری ہیں جو لیبل بدل بدل کر مختلف سیاسی جماعتوں کی صورت اختیار کرتے رہتے ہیں اور فلمی دنیا کے ایکسٹرا اداکاروں کے مانند منتظر رہتے ہیں کہ ایوان اقتدار کے اصل قابضین میں سے کس کی نگاہ کرم کب اور کس پر پڑتی ہے جو کچھ دیر کے لیے ''جسے پیا چاہیں، وہ سہاگن'' کے مطابق حریم اقتدار میں داخل ہو سکے۔گویا اس تجزیے کے مطابق تو پاکستانی سیاست میں نام نہاد قومی سیاسی جماعتوں کا کردار بھی ثانوی ہے۔تو ''تا بہ دیگراں چہ رسد؟'' اور ع

’’قیاس کن زگلستان من بہار مرا!‘‘ کے مصداق تیسرے نمبر پر شمار ہونے کے قابل علاقائی اور لسانی تنظیموں اور پھر ان کے بھی بعد چوتھے نمبر پر آنے والی مذہبی جماعتوں کے مثبت اور مستقل سیاسی رول کا اندازہ بخوبی کیا جا سکتا ہے۔ چنانچہ یہ اسی کا منظر ہے کہ پاکستان کی چھیالیس سالانہ تاریخ کے دوران صرف ایک مذہبی جماعت کے قائد نہایت مختصر مدت کے لیے پاکستان کے سب سے چھوٹے صوبے کے وزیر اعلیٰ رہے اور وہ بھی ان لوگوں کے سہارے جو علماءِ دین کے لیے اعلانیہ طور پر نہایت رکیک اور توہین آمیز الفاظ استعمال کرتے رہتے ہیں اور ایک دوسری جماعت کو پاکستان کے سب سے بڑے شہر میں قابل لحاظ عرصے کے لیے اقتدار حاصل رہا لیکن صرف بلدیات کی حد تک! البتہ ایک دوسرے اعتبار سے مذہبی جماعتیں پاکستان کی سیاست میں نہایت نمایاں اور موثر بلکہ فیصلہ کن کردار ادا کرتی رہی ہیں۔ اگرچہ اس کے بارے میں یہ فیصلہ کرنا مشکل ہے کہ وہ رول مثبت اور مفید رہا یا منفی اور مضر!...... ہماری مراد مختلف مواقع پر اٹھنے والی احتجاجی تحریکوں سے ہے جن کے نتیجے میں وقتاً فوقتاً ایوان حکومت میں زلزلے آتے رہے اور پاکستان میں اقتدار کی مستقل مثلث زاویے بدلتی رہی۔ چنانچہ اس میں کوئی شک نہیں کہ ایوب خاں کے خلاف برپا ہونے والی ایجی ٹیشن میں بھی سب سے موثر کردار مذہبی جماعتوں کا تھا۔ بعدازاں بھٹو صاحب کے اقتدار کے خاتمے کا سہرا بھی اصلاً مذہبی جماعتوں ہی کے سر تھا، اور اسی طرح نواز شریف اور بے نظیر کی حکومتوں کے خاتمے اور پھر الیکشن میں شکست کا کریڈٹ بھی سب سے بڑھ کر مذہبی جماعتوں کو ہی جاتا ہے اور اس کا سبب بھی بالکل واضح ہے کہ عوام کو قربانی پر آمادہ کرنے والا سب سے موثر جذبہ مذہبی ہی ہوتا ہے جس کے زیر اثر لوگ جانیں دے دینے کو سب سے بڑی کامیابی سمجھتے ہیں، تو ظاہر ہے کہ ’’منحصر مرنے پہ ہو جس کی امید، ناامیدی اس کی دیکھا چاہیئے!‘‘ کے مصداق احتجاجی مہموں اور مظاہراتی سیاست کے لیے ایسے لوگوں سے بڑھ کر کون موزوں ہو سکتا ہے! تاہم جیسے کہ عرض کیا جا چکا ہے اس رول کے مثبت یا منفی ہونے کا فیصلہ کرنا اس کا میزانیہ نفع ونقصان مرتب کرنا آسان کام نہیں ہے۔ اس لیے کہ جہاں یہ حقیقت اظہر من الشّمس ہے کہ ان احتجاجی تحریکوں کے نتیجے میں ایسی حکومتوں کا

خاتمہ ہو گیا جو مختلف طبقات کو مختلف وجوہات کی بناء پر ناپسند تھیں، وہاں اس میں بھی کوئی شک نہیں ہے کہ اس سے نہ اسلام کو کوئی حقیقی اور واقعی فائدہ پہنچا، نہ مذہبی جماعتوں کو کچھ حاصل ہوا۔ بلکہ اینٹی ایوب ایجی ٹیشن کی کمائی بھٹو صاحب نے کھائی اور اینٹی بھٹو ایجی ٹیشن کا فائدہ جنرل ضیاء الحق نے اٹھایا۔ گویا ع ’’مرے کام کچھ نہ آیا یہ کمال نے نوازی!‘‘ اس پر مستزاد یہ کہ ان تحریکوں کے نتیجے میں پاکستان میں سیاسی عمل کی گاڑی بار بار پٹڑی سے اترتی رہی۔ جس کے باعث عوام کا سیاسی شعور بھی ناپختہ اور نابالغ رہا۔ اور سیاسی ادارے بھی مسلسل شکست و ریخت کا شکار رہے! پاکستان میں قومی سیاست کے ضعف یا فقدان کے اسباب کا ذرا گہرا تجزیہ کیا جائے تو اس کی تہہ میں یہ عقدہ لاینحل بھی کارفرما نظر آتا ہے کہ حصول پاکستان کی تحریک مسلم قومیت کی بنیاد پر چلی اور اس کے دوران عوامی سطح پر سب سے زیادہ زوردار نعرہ اسلام کا لگایا گیا...... لیکن جب پاکستان قائم ہو گیا تو ع ’’جب آنکھ کھلی گل کی تو موسم تھا خزاں تھا!‘‘ کے مصدق جو واقعی صورتحال اور ٹھوس حقائق سامنے آئے وہ یہ تھے کہ اس میں آباد لوگوں کی غالب اکثریت میں اسلام کے ساتھ ایک جذباتی وابستگی تو تھی لیکن سیرت و کردار اور اعمال و اخلاق کا حال ؎

وضع میں تم ہو نصاریٰ تو تمدن میں ھنود
یہ مسلمان ہیں جنہیں دیکھ کے شرمائیں یہود!

کا مصداق اتم تھا یا اس سے بڑھ کر ؎

جانتا ہوں میں یہ امت حامل قرآں نہیں
ہے وہی سرمایہ داری بندۂ مومن کا دیں

اور ؎

جانتا ہوں میں کہ مشرق کی اندھیری رات میں
بے ید بیضا ہے پیرانِ حرم کی آستیں!

کی تصویر کامل!...... بلکہ اس سے بھی زیادہ خوفناک صورتحال یہ تھی کہ عوام تو پھر بھی کم از کم عقیدے کی حد تک اللہ اور رسول صلی اللہ علیہ وسلم، قرآن اور حدیث، اور جنت اور دوزخ

کے قائل تھے لیکن تعلیم یافتہ طبقات کا معتد بہ حصہ، جو قومی معاملات میں فیصلہ کن اہمیت کا حامل تھا۔

ہم تو سمجھے تھے کہ لائے گی فراغت تعلیم
کیا خبر تھی کہ چلا آئے گا الحاد بھی ساتھ

کا منہ بولتا ثبوت اور ع ''میرے اسلام کو اک قصہ ماضی سمجھو!'' کی مجسم تصویر تھا......اب ظاہر ہے کہ ''جذبات'' کے بل پر تو ''تحریکیں'' چلا کرتی ہیں، سیاست میں تو اس کے بالکل برعکس ٹھیٹھ حقائق اور ٹھوس واقعات کی عکاسی ہوتی ہے۔ چنانچہ پاکستان کی چھیالیس سالہ تاریخ کا بنظر غائر جائزہ لیا جائے تو وہ ایک جانب ان ہی ٹھوس حقائق واقعی اور دوسری جانب مذہبی جذبات اور امنگوں کی رسہ کشی کا مظہر نظر آتی ہے اور نصف صدی کے لگ بھگ کا عرصہ گزر جانے کے باوجود آج بھی اگر حالات و واقعات کے بین السطور قائم حقیقت بیں سے مشاہدہ کیا جائے تو صاف نظر آتا ہے کہ ایک جانب ہمارے معاشرے کی عمومی اور اقدار اور تعلیم یافتہ اور مقتدا طبقات کے مجموعی تصورات اور رجحانات ہیں جن پر عہد حاضر کی عالمی تہذیب کے زیر اثر مادہ پرستی، الحاد اور اباحیت کی گہری چھاپ ہے، جن کا تقاضا ہے کہ ملک مغرب کے مروجہ تصورات کے مطابق وطنی قومیت کے اصول پر مبنی ریاست قرار پائے اور مغرب کے سیاسی اور اقتصادی نظام کو سماجی اور تہذیبی اقدار سمیت جوں کا توں اختیار کر لیا جائے اور دوسری طرف مذہبی طبقات اور سیاست کے میدان میں برسر عمل مذہبی جماعتیں ہیں جو عوام کے مذہب کے ساتھ جذباتی لگاؤ کے سہارے قانون شریعت کی تنفیذ اور اسلام کی تہذیبی اقدار کی ترویج کی جانب زور لگا رہی ہیں۔ اس رسہ کشی کے ضمن میں مذہبی جماعتوں کا یہ دعویٰ تو یقیناً صحیح ہے کہ اگرچہ ہم پاکستان میں اسلامی نظام کے قیام اور قوانین شریعت کے نفاذ میں تاحال کامیاب نہیں ہو سکے لیکن ہماری میزان نتائج میں نفع اور کامیابی کے پلڑے میں یہ وزن کیا کم ہے کہ ہم نے یہاں سیکولر نظام کی جڑیں بھی مضبوط نہیں ہونے دیں لیکن قومی اور ملکی سطح پر یہ بات قابل غور ہے کہ اس منفی کامیابی (اگر اسے کامیاب قرار دیا جا سکے!) کی قیمت اگر قومی سیاست کے تعطل کی صورت میں ادا کی جاتی رہی تو شاید ملک ہی

ع ''آں قدح بشکست وآں ساقی نماند!'' کے مصداق حصے بخرے ہو کر ختم ہو جائے اور وہ شاخ ہی باقی نہ رہے جس پر نظام اسلام اور قانون شریعت کے آشیانے بنائے جا سکیں۔ گویا اس رسہ کشی کے جاری رہنے میں اس بات کا بھی اندیشہ موجود ہے کہ رسہ ہی بیچ میں سے ٹوٹ جائے......مزید برآں اس تعطل میں بھی خلاء تو بہرحال موجود نہیں ہے اور اس کے معنی بھی تو یہی ہیں کہ جاگیرداری نظام بھی جوں کا توں برقرار رہے اور سودی معیشت بھی علی حالہ قائم و دائم ہے اور نفاذ شریعت ایکٹ بھی نافذ ہوا ہے تو ایسا جسے جملہ مذہبی جماعتوں نے ''انسداد شریعت ایکٹ'' قرار دیا ہے۔ رہی بات مغربی معاشرت اور اس کے لوازم یعنی عریانی، بے حیائی اور فحاشی تو وہ دن دوگنی رات چوگنی ترقی کر رہی رہے ہیں! حاصل کلام یہ کہ انتخابی سیاست کے میدان میں سرگرم مذہبی جماعتوں کو اپنی حکمت عملی پر نظر ثانی کی شدید ضرورت ہے۔ چنانچہ بعض جماعتیں اس وقت اس انداز سے سوچ بھی رہی ہیں۔ لیکن بحالات موجودہ یہ اندیشہ وہمی اور خیالی نہیں ہے کہ وہ کسی ردعمل کا شکار ہو کر دوسری انتہا کی جانب نکل جائیں اور ماحول کو کم از کم حد تک سازگار بنائے بغیر اور خود اپنی صفوں کی ترتیب و استواری اور کارکنوں کی تربیت اور تزکیے کے ناگزیر تقاضے پورے کیے بغیر تصادم کی راہ اختیار کر لیں۔ جس کا نتیجہ ملک و قوم کے حق میں تباہ کن ہوگا اور دین و مذہب کے لیے بھی نہایت افسوسناک!...... بنابریں اس امر کی شدید ضرورت ہے کہ اس منہج نبوی کو اچھی طرح سمجھا جائے جس کے ذریعے تاریخ انسانی کا پہلا اسلامی انقلاب برپا ہوا تھا اور جسے اختیار کیے بغیر ع 'خدایا! آں کرم بارے دگر کن!'' کی آرزو شرمندہ تکمیل نہیں ہو سکتی!

⌘⌘⌘

مرکزی **انجمن خدّام القرآن** لاہور

کے قیام کا مقصد

منبعِ ایمان ......اور...... سرچشمۂ یقین

قرآنِ حکیم

کے **علم وحکمت** کی

وسیع پیمانے......اور......اعلیٰ علمی سطح

پر تشہیر واشاعت ہے

تاکہ امتِ مسلمہ کے فہیم عناصر میں **تجدیدِ ایمان** کی ایک عمومی تحریک برپا ہوجائے

اور اس طرح

اسلام کی نشاۃِ ثانیہ -اور- غلبہ دینِ حق کے دورِ ثانی

کی راہ ہموار ہوسکے

وَمَا النَّصْرُ اِلَّا مِنْ عِنْدِ اللّٰہِ

تنظیمِ اسلامی کا پیغام — نظامِ خلافت کا قیام

تنظیمِ اسلامی

مروجہ مفہوم کے اعتبار سے

نہ کوئی سیاسی جماعت نہ مذہبی فرقہ

بلکہ ایک اصولی

اسلامی انقلابی جماعت

ہے جو اولاً پاکستان اور بالآخر ساری دنیا میں

دینِ حق

یعنی اسلام کو غالب یا بالفاظ دیگر

نظامِ خلافت

کو قائم کرنے کیلئے کوشاں ہے!

امیر: **حافظ عاکف سعید**